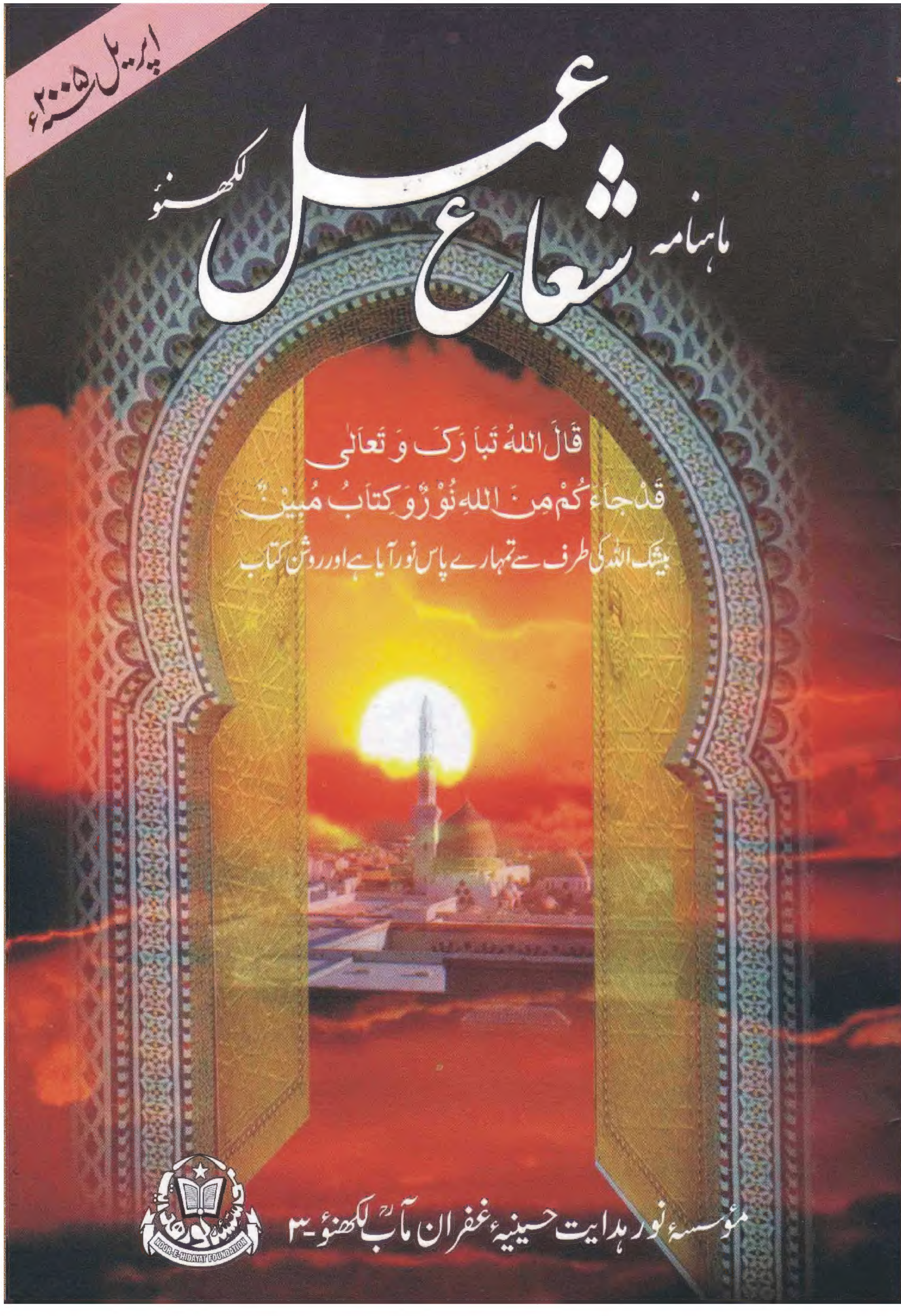


R.N.I.No. UPBIL/2004/13526-AprIL 2005

Monthly

SHUA-E-AMAL

Lucknow

शुआ-ए-अमल

हिन्दी, उर्दू मासिक पत्रिका

लखनऊ

NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION
Imambara Ghufran Maab, Chowk
LUCKNOW-3 (U.P.) INDIA
Phone : 2252230

فہرست مضامین

اپریل ۲۰۰۵ء

سخنان

زیرنظر شمارہ میں ان معصومین علیہم السلام کے تذکار جمیل ہیں جن کی ولادت وشہادت ایام ماہنامہ سے منسلک ہے ساتھ ہی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام جن کا تذکرہ محرم نمبر میں سہواً چھوٹ گیا تھا۔ تازہ جریدہ کی زینت ہے۔

ربیع الاول اصل میں ماہ بہار توحید وانسانیت ہے۔ اس شہر مشرف میں جہاں سید المرسلین خاتم النبیین رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد آمد ہے وہیں ناشر علوم اولین وآخرین معلم قرآن مبین مصحف ناطق حضرت امام جعفر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت باسعادت بھی ہے۔

سید العلماءؒ فرماتے ہیں

(۱) حضرت مرسل اعظمؐ:۔ ''جن کا اسوۂ حسنہ تمام مسلمانوں کے نزدیک واجب الاتباع ہے اور آپ کی سیرت خلق عظیم کا کامل مصداق ہونے کی بنا پر تمام افراد بشر کے لئے بلند ترین معراج ارتقا کی مثال ہے''

(۲) حضرت امام حسن علیہ السلام:۔ ''جنھوں نے امن وامان اور ملت اسلامیہ کی بہبودی کے لئے تاج وتخت کو ٹھکرا کر صلح پسندی کی مثال قائم کرنے کے ساتھ اپنے حکیمانہ شرائط صلح سے شریعت اسلام کے تحفظ کی اس ذمہ داری کو پورا کیا جو اُن کے لئے ایک مقصد حیات کی حیثیت رکھتی اور اس صلح کے مرحلہ کو انجام دے کر اس مجاہدۂ حق کے موقع کو قریب کیا جسے ۶۱ھ میں شہید کربلا حضرت امام حسینؑ نے انجام تک پہونچایا۔''

(۳) حضرت امام جعفر صادقؑ:۔ ''جنھوں نے علوم کے دریا بہادیئے۔ ان کے پہلے خدا پرستی کا وہ راستہ جسے حضرت محمد عربیؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا ظلم وستم کی آندھیوں سے شبہات واوہام کی گرد میں پٹ گیا تھا۔ اگر چہ آل رسولؐ میں سے ہر مقدس ہستی اس تعلیم کی حفاظت کرتی رہی اور اسی لئے قربانیاں پیش ہوتی رہیں مگر سیاسی اقدار کے شکنجوں نے زیادہ انھیں کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع نہیں دیا مگر حضرت باقرؑ وصادقؑ ان دونوں بزرگواروں کو اس وقت کے سیاسی حالات کی بنا پر اتنا موقع مل سکا کہ وہ رسولؐ کے گھرانے کے مقدس تعلیمات کو جونوع انسانی کے سُدھارنے کے ذمہ دار ہیں، نمایاں اور صاف کر کے دوبارہ دنیا کے سامنے پیش کرسکیں۔''

(۴) حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام:۔ ''آپ نے حقانیت کی راہ میں قید کی کڑیاں جھیلیں اور مدت مدید تک سختیاں برداشت کیں۔ آخر عمر کے کئی سال تمام وکمال قید خانے میں گذر گئے مگر آپ کی بلند سیرت کی روشنی اتنی تیز تھی کہ قید خانے کی اونچی اور سنگین دیواریں اس کے لئے ایک نازک وباریک پردہ سے زیادہ نہ تھیں جس کے اندر سے اس کی شعاعیں چھن چھن کر باہر نکلتی رہیں یہاں تک کہ چودہ صدیاں پار کر کے ہم تک بھی پہنچ سکیں ہیں۔''

(۵) حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام:۔ ''آپ کی زندگی بھی جلاوطنی اور قید وبند میں گذری مگر علوم واحکام آل محمدؐ کی اشاعت کے کام کو جاری رکھا۔''

ہائے علم دوست محسن

حیف صد حیف کہ اب نظروں کے سامنے چودھری صاحب نہیں رہے۔ اپنے وطن عزیز اکبر پور حسینؑ مظلوم کے ماتم میں شرکت کے لئے حسب معمول اپنے تکالیف کو فراموش کر کے پہنچ گئے اور چند دنوں خاتونؑ جنت کو پرسا دے کر جمعہ ۸؍محرم الحرام ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۸؍فروری ۲۰۰۵ء کو عاشق صادقِ محمدؐ و آل محمدؐ، عزادارِ وفادارِ سیدالشہداء ارواحنا لہ الفداء نے محبتِ اہل بیتؑ پر نقدِ جان نچھاور کر کے اپنے ملک و وطن کو الوداع کہہ دیا۔

چودھری نے جان دے دی بڑھ کے پائے شاہؑ پر		عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

محقق یگانہ، ادیب العصر، فاضل نبیل مولانا چودھری سبط محمد نقوی صاحب قبلہ مرحوم و مبرور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ سراپا کہ دنیا سر کہے، دماغ مرکزِ معقولات، سینہ مخزن علوم، کان حق نیوش، نگاہیں دوررس و حق بین، زبان سخن سنج و سخن نواز، منھ بے حد چٹورا، پیٹ بیشتر اوقات اپنے مقصد حیات کی طرف متوجہ، دست ہائے حق پرست ہمہ وقت اپنے فرائض کی ادائیگی خصوصاً قلم نوازی و ادب پروری میں مصروف، قدم ہمیشہ راہ وضع داری و وفاداری کے رہ نورد نیز وادئ محبت و ہمدردی میں گامزن۔

چودھری صاحب بلند پایہ ادیب، خطیب، مورّخ، محقق، ناقد، منقد، مدبّر، منظم، مصلح، مخلص، محسن، حق گو، بے باک، صاحب نظریات، عالم، عامل، صحافی، مدیر، بانی، ہمدرد، سیاست داں اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر گر، قلم پرور، محترم علماء اور طلاب نواز یعنی بھرپور اور بے لوث علم دوست شخص تھے۔

اے سراپا شفقت و احترام!		''ایسا کہاں سے پائیں کہ تجھ سا کہیں جسے''

ایسے دورِ قحط الرجال میں ماتیؔ جائسی مرحوم کا ایک شعر رہنمائی و تسکینِ خاطر کا کام انجام دیتا ہے۔

راہ سونی ہے اکیلا ہی چلا جا ماتیؔ		اب کہاں قافلۂ اہل وفا رکھا ہے

آخر میں مہندس شبیب اکبر نقوی اثیرؔ جائسی کے وہ چند شعر جو (ھل جزاء الاحسان الا الاحسان) کے تحت نظم ہوئے ہیں پیش ہیں:

تھا علم دوست بھی اور وقت کا ادیب بھی تھا		خلوص و عزم سے بے انتہا قریب بھی تھا
حیات ساری سخن مندیوں میں گذری ہے		مُحِب قلم کا تھا افکار کا حبیب تھا وہ
ولائے سبطِ محمد پہ جان دے دینا		یہی دلیل ہے اس کی کہ خوش نصیب تھا وہ
زبان و خامہ سے حق گفتنی کا کام لیا		اس عہد مکر میں کہئے بڑا عجیب تھا وہ
وہ چودھری جسے نباض وقت کہہ لیجے		ادب کا فکر کا تاریخ کا طبیب تھا وہ
خطیب و ناقد و شاعر تھا مرد حق گفتار		سخن نواز و سخن پرورِ عجیب تھا وہ
اثیرؔ کیوں نہ کرے اس کی خوبیاں تحریر		بزرگ ہوتے ہوئے واصفِ شبیب بھی تھا

(ادارہ)

قرآن شناسی

قرآن میں رسالت کے جلوے

جناب ڈاکٹر محمد جواد سہلانی صاحب
ترجمہ: جناب سید محمد ظفر حسینی صاحب

تعلیم وتربیت کی بنیاد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ الْمَلِکِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ○
ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○

ہمیں قرآن مجید سے اصول تربیب دریافت کرنا ہیں، اس لئے کہ آیۂ مذکورہ سے بات کا آغاز ٹھیک ہے۔ آیت کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ: ''زمین وآسمان کی ہر شے اس خدا کی تسبیح میں مصروف ہے جو حاکم ہے پاک وپاکیزہ ہے اور حکیم مطلق ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تمام مخلوق اللہ کی تسبیح وتحلیل کرتی ہے تو انسان کو بھی اس امر میں سب کے ساتھ ہونا چاہئے چونکہ خداوندعالم نے انسان کو فاعل مختار خلق کیا ہے لہٰذا اس کی تسبیح وتہلیل نیّت وارادے سے ہونا چاہئے اور اس کے لئے انسان علم وآگہی کا محتاج ہے۔

یہ آگاہی ذاتی (حضوری طور پر) ہوگی یا حصولی (طور پر)۔ علم حضوری (ذاتی) بھی مادی وروحانی دونوں طرح کا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اس علم کا اکتساب وحصول کبھی وحی سے ہوتا ہے اور کبھی اس کا سرچشمہ تحقیق وتجربہ ہوتا ہے، علم ذاتیِ مادی کا لازمہ جسمانیات وطبیعات پر مشتمل وہ ظاہری اسباب ہیں جن کے عطا کئے جانے کے بارے میں خداوندعالم نے قرآن مجید میں نشاندہی فرمائی ہے، چنانچہ سورۂ نحل (۷۸) میں ارشاد ہوا ہے:

''وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ''

یعنی (اللہ نے) تمھیں کان، آنکھ اور دل کی نعمتوں سے نوازا۔

علم ذاتیِ معنوی بھی انسان کو خداوندعالم کی جانب سے ودیعت ہوا ہے، اور یہ مفہوم سورۂ روم کی تیسویں آیت سے اخذ ہوتا ہے جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''فِطْرَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا۔۔۔۔۔''

اللہ نے انسان کو وہ علوم جن کا سرچشمہ وحی والہام ہیں، بالواسطہ اور بلا واسطہ دو مختلف مستقیم راستوں سے مرحمت فرمائے ہیں، بلاواسطہ سے الہام باطنی مراد ہے جس کے بارے میں ارشاد ہورہا ہے:

''وَنَفْسٍ وَّمَاسَوّٰاھَا ○ فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا

وَتَقْوٰھَا۔'' (الشمس:۸،۷)

اور بالواسطہ سے مراد انبیاء ومرسلینؑ کی تبلیغات وارشادات ہیں چنانچہ سورۂ جمعہ کی دوسری آیت اور تیسری آیت اس مضمون پر مشتمل اور گواہ ہے۔

انسان کے تجرباتی، مطالعاتی اور مشاہداتی علوم سے مراد اس کی وہ معلومات ہیں جو اسے خداوندعالم کی جانب سے عطا کی گئی صلاحیتوں اور قوتوں کے استعمال کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہیں تاکہ انسان مخلوقات عالم کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے اپنے تمام فرائض اور شرعی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے ورنہ اسے جواب دہ ہونا پڑے گا اور سزاوار مواخذ و مستحق عقاب ٹھہرے گا، یہ مفہوم قرآن کریم کی متعدد آیتوں سے اخذ ہوتا ہے مثلاً سورۂ شمس کی نویں اور دسویں آیتیں بھی ہیں، جن میں ارشاد ہوا ہے:

''قَدْاَفْلَحَ مَنْ زَکّاھَا۔ وَقَدْخَابَ مَنْ دَسّٰھا''

اب اگر ہم آج کی موجودہ اصطلاحات کو پیش نظر رکھ کر تعلیم وتربیت کی تعریف یوں کریں: ''وہ سورسز (مآخذ) جن کے ذریعے انسان کو مہارتیں اور صلاحیتیں حاصل ہوتی اور ان کی اقدار معلوم ہوتی ہیں۔''

مقصد تعلیم وتربیت:

''انسان کو ترقی وکمال کے لئے زیادہ صلاحیتیں مہیا کرنا۔''

تعلیم کے بعد نتیجہ:

''انسان کو مفید ومؤثر زندگی کے لئے تیار کرنا اور نامساعد حالات میں نفسیاتی اعتدال کا مالک بنانا۔''

یہ بات جاننے کے بعد سمجھ سکیں گے کہ انسان کو ایک مسلسل ودوامی ہم آہنگی درکار ہے جو اپنے اور دوسروں کے درمیان برقرار رکھے۔

اب قرآن کو دیکھتے ہیں وہ اس بارے میں کیا رہنمائی کرتا ہے، ارشاد باری ہے:

''الذی خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً'' (المُلک:۲)

موت وحیات کی تخلیق تمہارے حسن عمل کے امتحان کی خاطر ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ بہترین کردار کے حصول کے لئے پیہم کوشاں رہے اب یہ دیکھیں کہ قرآن میں ''حسنہ'' یعنی نیکوکاری کا معیار کیا ہے؟ ارشاد ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنۃ۔ (الاحزاب:۲۱)

نیکوکاری کا معیار پیغمبرؐ خدا کا کردار ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

لقد منّ اللہ علی المومنین اِذبعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلالٍ مبین (آل عمران:۱۶۴)

یعنی بہ تحقیق، خدا کا لطف واحسان ہے صاحبان ایمان پر جن کے درمیان سے اس نے انھیں میں کا ایک

رسول منتخب کیا جو ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت اور ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔

اس آیت سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اگر انسان پیغمبران خدا کی سیرت وکردار کو اپنے لئے معیار عمل قرار نہیں دے گا تو ہمیشہ کھلی ہوئی گمراہیوں میں مبتلا رہے گا۔ یہاں اگر کسی ذہن میں یہ بات آئے کہ ''ضلال مبین'' (یعنی کھلی ہوئی گمراہی) کا تعلق صرف اسلاف اور گذشتہ زمانے کے افراد سے ہے تو اس وہم کی تردید سورۂ جمعہ کی تیسری آیت میں موجود ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے:

''و آخرین منهم لما یلحقوا بهم'' (الجمعه:۳)

یعنی وہ دوسرے افراد جو ابھی تک ان لوگوں (اسلاف) سے نہیں جا ملے ہیں۔ لہٰذا، قرآن کریم، صحیح اور الٰہی وحقیقی تربیت کی اساس۔ تلاوت آیات، تزکیہ نفس اور تعلیم کتاب وحکمت کو بہترین ذریعہ قرار دیتا ہے اور درجہ بدرجہ ضرورت کے مطابق تعلیم وتربیت کی ترویج اور پھیلاؤ یا نئی داغ بیل ڈالنے کے مسئلے کو واضح کرتا ہے۔

اب ہمیں یہ تجزیہ کرنا ہے کہ اس کام کی ضرورت کے واقعی اسباب کیا ہیں؟ قرآن مجید نے چند ایسے امور کو بنیاد بتایا ہے جو نقصان کا سبب اور انسان کے باطن میں پوشیدہ ہیں، مثلاً:

۱۔ انسان کمزور وناتواں خلق ہوا ہے۔

خلق الانسان ضعیفا۔ (النساء:۲۸)

۲۔ انسان جلد باز خلق ہوا ہے۔

خلق الانسان من عجل۔ (الانبیاء:۳۷)

۳۔ انسان حریص خلق ہوا ہے۔

ان الانسان خلق هلوعا۔ (المعارج:۱۹)

۴۔ انسان ظالم وجاہل ہے۔

انه کان ظلوماً جهولاً۔ (الاحزاب:۷۲)

۵۔ انسان سرکش اور نافرمان ہے۔

ان الانسان لیطغی۔۔۔۔۔۔ (علق:۶)

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ انسانی زندگی کے یہ منفی پہلو حیات میں توازن اور روح بشری میں اعتدال برقرار رکھنے کے لئے بے حد ضروری ہیں اور آزادی واختیار ان کے انتہائی لازمی اجزا سمجھے جاتے ہیں اور یہ راز درج ذیل آیہ کریمہ سے بخوبی آشکار ہے:

''لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم''

(التین:۴)

ہم نے انسان کو بہترین شکل وشمائل میں خلق کیا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سب سے پہلی منزل میں انسان کو دنیا میں عمل صالح کی طرف پوری توجّہ دینی چاہئے کیوں کہ وہ امتحان الٰہی کی منزل میں ہے، دوسرے اسے نیک اعمال کے سلسلے میں معیار اور کسوٹی، پیغمبر خدا کو قرار دینا چاہئے۔ تیسرے چوں کہ انسان کی زندگی میں کچھ منفی رخ بھی پائے جاتے ہیں لہٰذا اسے وہ راستہ اپنانا چاہئے جس کے ذریعہ وہ برے اور منفی پہلوؤں کو اچھے اور مثبت پہلوؤں میں تبدیل کرسکے، چوتھے یہ کہ اس ارتقا سے مراد مختصر الفاظ میں آیات الٰہی کا مطالعہ، تزکیہ نفس

اور کتاب وحکمت کی تعلیم ہے۔

آیئے اب یہ جائزہ لیں کہ تزکیہ وتعلیم پر مشتمل آیتوں سے کون سے اہداف اور اغراض ومقاصد مراد ہیں؟

الف: آیات الٰہی کے مطالعہ سے قرآن مجید کی آیتوں کی تلاوت بھی مراد ہے جیسا کہ ارشاد ہو رہا ہے: ''ان فی ذلک لآیات لقوم یؤمنون'' (الزمر: ۵۲) اور اس سے عالم طبیعت میں فطرت کی کاری گری اور قدرت کی صناعتوں کا مطالعہ ومشاہدہ بھی مقصود ہے، چنانچہ ارشاد ہو رہا ہے:

''وکائین من آیۃ فی السمٰوات والارض''

(یوسف: ۱۰۰)

اس سے مراد خود انسان، اپنا ذاتی وجود بھی ہے، چنانچہ اس سلسلے میں قرآن کا ارشاد ہے:

''بل ھو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم۔۔۔۔ (العنکبوت: ۴۹)

خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان عمیق نظروں سے معجزات اور رحمت الٰہی کے کرشموں اور اس کی ان روشن نشانیوں کا مطالعہ کرتا ہے جن کے ذریعہ ذات الوہیت کا یقین ہوتا ہے، جن کی ایک مثال اس ایۂ کریمہ میں موجود ہے:

''وجعلنا ابن مریم وامہ آیۃ۔ (المومنون/۵۰)

تو اس امر کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ موجودات عالم اور خدا کی بے شمار رنگا رنگ نشانیوں کے بارے میں غور وخوض، فکر ونظر اور تحقیق ومطالعات کے ذریعہ بے شمار علمی نتائج اور تربیتی ذخائر ہمارے ہاتھ آسکتے ہیں۔

ب: تزکیہ نفس:

اس سے مراد ہر طرح کی کثافتوں اور آلائشوں سے جسم وروح کی تطہیر نیز ان کا بُری تاثیرات سے پاک رکھنا اور آزادیِ بشر کے اصولوں کی مکمل مراعات ہے، تزکیہ، سچی تعلیم اور صحیح تربیت کے اصولوں میں سرفہرست قرار پاتا ہے۔

یہ مفہوم سورۂ بقرہ کی ۱۲۹ویں اور ۱۵۱ ویں آیتوں میں، سورہ آل عمران کی ۱۶۴ویں آیت اور سورۂ جمعہ کی دوسری آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، ان چاروں آیتوں میں تزکیہ اور تعلیم ایک دوسرے کے لازم وملزوم کی حیثیت سے ذکر ہوئے ہیں، جس میں تین جگہوں پر تزکیہ کا تذکرہ تعلیم سے پہلے کیا گیا ہے۔ ہم اس قرآنی تربیت کے ذریعہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ تزکیہ نفس کے مرحلے کو تعلیم سے پہلے سر کرنا چاہئے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ چوں کہ قرآن میں تزکیہ وتعلیم ہر مقام پر ساتھ ساتھ آئے ہیں لہٰذا جسم وروح کی تطہیر اور تعلیم وتربیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے، یعنی خواہ حصول علم سے پہلے یا اس کے بعد، دونوں ہی صورتوں میں انسان کو علم کے صحیح استعمال کے لئے توازن واعتدال برقرار رکھنے کے واسطے ایک کنٹرولنگ مشین کی ضرورت ہے جسے ہر وقت اپنی توجہ کا مرکز رکھنا چاہئے اور اسی کے مطابق عمل کرنا چاہئے چنانچہ یہ کنٹرولنگ مشین یہی انسان کی صفائے قلب اور تطہیر وتزکیۂ نفس ہے جس کے ضمن میں اخلاقی مباحث سامنے آتے ہیں۔ دوسری طرف اگر انسان اس تربیت سے مالا مال نہیں ہو پاتا جو اس کی خداداد فطرت کا تقاضہ ہے تو پھر اس کے ارتقا کی راہ

میں ایک زبردست پہاڑ حائل ہوجاتا ہے جس کے بعد وہ زندگی کے حقیقی مسائل پر غور وفکر نہیں کرسکتا بلکہ اپنی شخصیت اور ذاتی صلاحیتوں پر توجہ کے بغیر یہ چاہنے لگتا ہے کہ دوسروں کے ایسے نظریات وافکار پر خود کو منطبق کرے جو انھوں نے اس کی صلاحیت واستعداد اور کردار واعمال کے بارے میں قائم کئے ہیں۔ آگے بڑھ کر یہی لوگ اپنے آپ کو بے شمار قیود اور اوہام وخیالات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا پاتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر زندگی کی مختصر ومعمولی سرگرمیوں اور بے بنیاد مسرتوں کو ہمراہ لئے دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ قرآن نے ان کے حالات کی تصویر کشی کی ہے:

''ضاقت علیهم الارض بمارحبت وضاقت علیهم انفسهم'' (التوبہ:۱۱۸)

یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے زمین اپنی تمام تر وسعتوں اور کشادگیوں کے باوجود تنگ ہوگئی اور انھوں نے خود ہی اپنی زندگی کو تنگیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔

لیکن جب انسان اسوۂ حسنہ یعنی کردار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ ہوجاتا ہے تو اوہام کی زنجیریں ٹوٹ کے گر پڑتی ہیں اور اس کی روح ہلکی اور پُرسکون ہوجاتی ہے، جسے قرآن نے اس آیۂ کریمہ میں بیان فرمایا ہے:

''الذین یتبعون الرسول النبی الأمی۔۔۔۔۔۔ ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم'' (الاعراف:۱۵۷)

یعنی وہ لوگ جو اللہ کے اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جس نے کسی کے پاس تعلیم نہیں حاصل کی ہے، یہ وہ رسولؐ ہے جو ان کے بھاری بوجھ کو ہلکا کرتا ہے (یعنی انھیں بے جا رسم ورواج اور اوہام پرستی سے نجات دلاتا ہے) اور ہر طرح کے قید وبند نیز غلط افکار وخیالات کی مضبوط زنجیروں سے آزادی دلاتا ہے۔

اب اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ علم اسے ڈسنے نہ پائے اور وہ حرص وہوس اور خواہشات نفسانی میں پھنسنے نہ پائے، نیز دوسروں کے ظلم وزیادتی اور فریب وجعل سازی کا شکار نہ ہونے پائے اور خود کو دنیا کی جھوٹی رعنائیوں اور رنگینیوں کا اسیر نہ ہونے دے تو اس پر واجب ولازم ہے کہ علوم وفنون حاصل کرتے وقت نیز اس سے پہلے اور بعد حقیقی ترقی کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرے، یعنی بالفاظِ قرآن تزکیہ نفس کو اپنا نصب العین قرار دے۔

ج: مسئلہ تعلیم:

قرآن میں جس قدر تعلیم وتعلم پر زور دیا گیا ہے کسی دوسری کتاب میں اس مسئلے کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے غیر مسلم محققین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

قرآن کریم کی آیتوں میں جو آیت سب سے زیادہ اس سلسلے میں روشنی ڈالتی ہے وہ سورۂ زمر کی نویں آیت ہے:

''هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون'' جس کا مفہوم فارسی کے شاعر شیخ سعدی کی زبان مین یوں بیان ہوا ہے

کجا جانِ دانا ونادان یکیست

یعنی عالم وجاہل دونوں کی زندگی کی قیمت کب برابر ہے؟

یا پھر قرآن کی وہ آیت اہمیت علم کی وضاحت کرتی ہے جس میں خدائے وحدہٗ لاشریک نے عادل علماء کے ہمراہ خود اپنی ذات کو بھی گواہی کے لئے پیش فرمایا ہے:

شهد الله انه لااِله الّا هوا والملائكة واُولو العلم قائما بالقسط لاالاالههواالعزيز الحكيم''

(آل عمران:۱۸)

نتیجۂ گفتگو:

تعلیم وتربیت کے سلسلے میں قرآن کریم کی تاکید تحصیل علم اور حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظیم تعلیم وتربیت کے نتیجے میں مسلمانوں کی فکر روشن کا کرشمہ تھا کہ چودہ سو سال قبل دنیا کی انتہا سے زیادہ ایک غیر متمدن اور پسماندہ قوم میں ایک مثالی تمدن نے جنم لیا اور دیکھتے دیکھتے عالمی ثقافت وتمدّن کا روح رواں بن گیا۔

اس فلسفے کی نتائج:

یہ علمی وتربیتی کارنامہ کچھ اتنا عظیم اور محیّر العقول تھا کہ جب غیر اسلامی دنیا متمدن ہوئی تو اس کے بڑے بڑے علماء ومحققین نے اسلام کی اس عظمت کو مجبوراً تسلیم کیا۔ ہم ذیل میں ان معترفین میں سے چند کے نام تحریر کررہے ہیں، جنھوں نے اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب یا مقالہ تحریر کیا ہے:

۱۔ انگریز محقق، برٹرنڈ رسل: ''مغربی فلسفہ کی تاریخ''

۲۔ فرانسیسی مصنف، گوستاولوبون۔ کتاب۔ ''اسلام اورعرب کی تاریخ تمدن''

۳۔ امریکی مصنف، جارج سارٹن: ''تاریخ علم پر مقدمہ''

۴۔ امریکی مصنف، ویل ڈیورانٹ: ''تاریخ تمدن''

۵۔ فرانسیسی مصنف، آن فرمانتل: ''عصر اعتقاد''

۶۔ فرانسیسی مصنف، فرانسوا جوزف پی کاوے: ''اسلامی فلسفہ پر ایک مقدمہ''

۷۔ امریکی مصنف، ہرمن رینڈل: ''ذہن جدید کا سفر ارتقا''

۸۔ آئرلینڈ کے جان برنان: ''علم تاریخ کے آئینے میں''

۹۔ فرانسیسی مصنف، پی روسو: ''تاریخ علوم''

۱۰۔ فرانسیسی مصنف، والٹر نے اپنے متعدد مقالات میں اعتراف کیا ہے۔

ان مشہور مصنفین میں تاریخ علم کے نامور محقق، جارج سارٹن کے خیالات ملاحظہ کریں، جو اپنی ایک کتاب ''علم کی کہانی'' میں رقم طراز ہے:

''اسلامی تمدّن نے علم کو جو دولت عطا کی ہے اسے اس مقالہ میں فہرست کے طور پر بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔دو صدیوں سے بھی کہیں کم عرصہ میں ایک جدید علمی، عالمی اور نہایت عظیم الشان تمدّن کی تخلیق ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس سے کچھ سیکھنا اور سبق لینا چاہئے اور اس حق کو پامال نہ کرنا چاہئے۔

ہاں! یہ بات کیسے ممکن ہے کہ لوگ اس حقیقت کا اعتراف نہ کریں جب کہ آخری چار صدیوں کے دوران انسانس کے مشہور دور کی دھما کہ خیزیوں کے بعد، انھوں نے حصول علم اور اس کی جمع آوری کے تمام پہلوؤں کو مسلمان علماء سے حاصل کیا ہے، جدید طالب علموں نے درس کے

وقت یادداشت کے طور پر لکھنے کے آداب اور خود یادداشت کرنے کو اور طلاب کو سند عطا کرنے کے سلیقوں کو بھی، (جو ایک علمی اور تربیتی نظام کے جدید ترین لوازم میں سے ہیں) مسلمانوں ہی کی کتابوں سے سیکھا، یہاں تک کہ ان لوگوں نے ایک دوصدی قبل ان میں سے بعض کتابوں کا ترجمہ بھی کرڈالا جیسے کتاب ''ادب الاملاء والاستملاء'' جس کے مصنف عبدالکریم سمعانی ہیں اور اس کا ترجمہ جرمن زبان میں ہوا اور کتاب ''الاجازه فی فنون التدریس عندالاسلام'' جس کا ترجمہ ۱۸۵۵ء میں فرانسیسی زبان میں پیرس میں ہوا۔

یورپ والے ایک طویل عرصہ تک اپنی یونیورسٹیوں کے نصاب کی کتابوں کا انتخاب تدوین شدہ اسلامی مآخذ سے کرتے تھے، وہ مشہور ومعروف کتابیں جن سے وہ اپنی یونیورسٹیوں کی تعلیم میں پیہم استفادہ کرتے رہے، درج ذیل ہیں:

۱۔	کتاب الحساب	تصنیف خوارزمی
۲۔	مساحة الاشکال	تصنیف بنی شاکر
۳۔	الرّسائل	تصنیف ابومشعر بلخی
۴۔	الرّسائل	تصنیف محمد بن جابر بتانی
۵۔	الھیئت	تصنیف فرغانی
۶۔	صورالکواکب	تصنیف عبدالرحمن صوفی
۷۔	المناظر والمرایا	تصنیف کندی
۸۔	کتاب الریح المطر	تصنیف کندی
۹۔	نزهة المشتاق	تصنیف ادریسی
۱۰۔	تقویم البلدان	تصنیف ابوالفداء
۱۱۔	المفردات	تصنیف ابن بیطار
۱۲۔	الحاوی	تصنیف رازی
۱۳۔	طب المنصوری	تصنیف رازی
۱۴۔	القانون	تصنیف ابن سینا
۱۵۔	المناظر	تصنیف ابن ہشیم
۱۶۔	اصلاح المجطی	تصنیف جابر بن افلح
۱۷۔	کتاب التصریف فن جراحت	تصنیف ابوالقاسم زہراوی
۱۸۔	تقویم الابدان	تصنیف ابن قزلہ
۱۹۔	الکلیات	تصنیف ابن رشد
۲۰۔	الرّسائل	تصنیف فارابی
۲۱۔	الرّسائل	تصنیف ابن سینا
۲۲۔	کتاب الموسیقی	تصنیف ابن ماجہ
۲۳۔	مقاصد الفلاسفہ	تصنیف غزالی

درحقیقت اہل مغرب کی یونیورسٹیوں کا قیام، علمائے اسلام کے ذریعہ علوم وفنون کی باریک درجہ بندیوں سے حاصل شدہ نتائج کا مرہون منت ہے۔ وہ مسلمان علماء جنھوں نے علوم کی تقسیم اور درجہ بندی کے سلسلے میں اہم کتابیں تحریر کی ہیں، ان میں سے چند اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ فارابی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''احصاء العلوم''

۲۔ ابن سینا۔۔۔''رسالة فی اقسام العلوم'' اور ''شفا''

۳۔ ابن خلدون۔۔۔۔۔۔۔۔''مقدمہ''

۴۔ ابن حزم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''مراتب والعلوم''

۵۔ شہید ثانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''منیة المرید''

مختلف علمی شعبوں میں مسلمانوں کی تالیفات اور مغربی تمدن پر ان کے اثرات کچھ اتنے زیادہ ہیں کہ ہر شعبے

میں صرف فہرست کی تدوین کے لئے ایک مستقل اور ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ اس مقام پر ہم مسلمانوں کے درمیان رائج چند مشہور علمی شعبوں کے تذکرے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ حکمت و اخلاق:

قرآن اور رسولؐ خدا کے بعد اس شعبہ کے واضع اور مدوّن ابن ابی الحدید کے نظریہ کے مطابق امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں اور نہج البلاغہ اس دعوے کی بہترین دلیل ہے۔

نہج البلاغہ کے بعد ''صحیفۂ سجادیہ'' امام علیؑ بن حسینؑ کی اور اس کے بعد ''الکافی''، کلینیؒ، ''تحف العقول'' حرّانیؒ، ''خصال'' شیخ صدوقؒ، ''تحصیل السعادۃ'' فارابیؒ، ''اخلاقیات الشفا'' ابن سینا، ''اخلاق ناصری'' خواجہ نصیرالدین طوسیؒ، ''احیاء العلوم'' غزالی، ''مصابیح القلوب'' بوعلی بیہقیؒ، ''الآداب الدینیہ'' شیخ طبرسی، ''ارشاد القلوب'' شیخ ابومحمد حسن دیلمیؒ، ''مکارم الاخلاق'' شیخ ابومنصور طبرسی، ''عیون الحکم والمواعظ'' شیخ علی بن محمد لیثی واسطی اور ''اخلاق جلالی'' ملا جلال الدین دوانیؒ۔

۲۔ فقہ، حقوق، قانون:

ان موضوعات پر اتنی زیادہ تعداد میں بیش بہا جواہر پارے موجود ہیں جن کی حیثیت سچ مچ ایک بیکراں سمندر کی ہے، ان میں سے کچھ نام درج ہیں:

کتاب الفاظ والمباحث: از ہشام بن حکم۔

کتاب اختلاف الحدیث ومسائلۃ: از یونس بن عبدالرحمن۔

کتاب الخصوص والعموم: از ابوسہل نوبختی۔

الذریعہ الی اصول الشریعہ: از علم الھدیٰ، سید مرتضیٰ۔

عدۃ الاصول: از شیخ ابوجعفر طوسیؒ۔

کتاب المصادر: از سدید الدین حمصی۔

تہذیب الاصول: از علامہ حلی۔

کتاب المستصفی: از ابوحامد غزالی۔

کتاب مختصر الاصول: از ابن حاجب۔

کشف الاسرار: علاء الدین بخاری۔

کتاب الموافقات: از ابواسحاق شاطبی۔

۳۔ علوم عقلی:

یہ موضوع بھی اتنا زیادہ وسیع اور بے پایاں ہے کہ اس کی سرحدیں اور کنارے بھی ہمارے لئے ناپید و ناآشکار ہیں، یہاں پر ہم چند ایسے بااثر مفکرین کے اسماء کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو رنسانس کے بعد یورپ والوں کے یہاں معارف عقلی کا خاکہ مرتب کرتے ہیں براہ راست اثر انداز ہوئے ہیں جن میں یعقوب بن اسحاق کندی، ابونصر فارابی، ابن الولید بن رشد، ابوعلی سینا، ابن خلدون، ابن طفیل اور سہروردی کے نام سر فہرست ہیں۔

۴۔ اسلامی فنون:

متأخر مغربی فنکاروں کے آراء و نظریات پر اسلامی فن کس قدر اثر انداز ہوا ہے؟ اس کے جواب کا جواب اور تفصیلی

اعتراف بہت سے مصنفین نے کیا ہے: مثلاً یہ تین کتابیں:
''اسلامی فن کی تاریخ''، تصنیف کرسٹن پر ایس۔
''اسلامی صنعت کی رہنما'' از ایم۔ ایس۔ ڈیمانڈ
''میراث اسلام'' از آربری و پروفیسر گب۔
نیز بہت سے مصنف

۵۔ اسلامی ادبیات:

اگر ہم ادبیات اسلام کے موضوع سے متعلق بھی مختصراً کچھ لکھنا چاہیں تو خلاصہ کے طور پر کچھ قلم بند کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ہم اس سلسلے میں بھی ایک دو باتوں کی طرف اشارے پر اکتفا کرتے ہیں۔

''حی بن یقظان کا تربیتی فلسفی قصہ'' جو ابن طفیل اندلسی کی تصنیف ہے، نہ صرف یہ کہ یہ کتاب ۱۳۴۹ء سے لے کر ۱۹۶۳ء تک عبرانی، لاطینی، ہولینڈی، انگریزی، جرمنی، اسپینی، فرانسیسی، روسی اور ۔۔۔۔۔۔۔۔ زبانوں میں ترجمہ ہو کے بارہا چھپ چکی ہے بلکہ اہل مغرب کے متعدد قلمی پہلوؤں پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔

ہم یہاں کتاب ''میراث اسلام'' کے ادبی حصے کے مصنف، پروفیسر کا ایک قول نقل کر رہے ہیں:

''ہمیں یہ راز جان لینا چاہئے کہ وہ مشرق یعنی اسلام ہی ہے جس نے یورپ والوں کے لئے ایسی نئی نئی راہیں کھولیں جن کے ذریعہ وہ آج ادبیات کے شعبہ میں اس موجودہ منزل پر پہنچے ہیں۔''

تیسری بات قابل ذکر یہ ہے کہ اہل مغرب کے ادب پر اسلامی ادبیات نہ صرف یہ کہ قابل صد تعریف تاثیر کے حامل رہے ہیں، بلکہ ادبی علوم سے متعلق ایسی کتابیں جن کا انحصار کسی ایک فرد پر ہو، صرف مسلمانوں ہی نے تالیف کی ہیں اور یورپ کے محققین نے ان کا ترجمہ کیا اور انھیں سنوارا ہے۔ جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

عبدالوہاب زنجانی کی کتاب ''التصریف'' کا ترجمہ لاطینی میں متن کے ہمراہ ۱۶۱۰ء میں فلورنس میں زیموندیس نے کیا۔

محمد بن داؤد صنہاجی کی کتاب ''الاجرومیۃ'' کا ترجمہ لاطینی میں ۱۶۳۱ء میں کشیش اوپیشینی'' نے اور فرانسیسی میں ۱۸۴۶ء میں بریزنیئر نے کیا۔

زین الدین ابوالحسن یحییٰ کی کتاب ''الفیہ'' کا ترجمہ متن اور تعلیقات سمیت ہولینڈ کی زبان میں ۱۸۹۵ء میں، لیپزک میں کے۔ وی۔ زیئرسئی نے کیا اور فرانسیسی زبان میں ۱۸۸۷ء میں قسطنطنیہ میں ایل پنٹو نے اور ۱۸۸۸ء میں بیروت میں اے۔ گوگیئٹ نے کیا۔

ابن ہشام انصاری کی کتاب ''شرح قطر'' کا ترجمہ متن سمیت فرانسیسی میں ۱۸۷۷ء لندن میں اے۔ گوگیئٹ نے کیا۔

سیبویہ کی کتاب ''شرح الکتاب'' کا ترجمہ مقدمہ اور حواشی سمیت فرانسیسی زبان میں ۱۸۸۹ء میں ایچ۔ ڈیرر برگ نے کیا۔

ابن حاجب کی کتاب ''الکافیہ'' کا ترجمہ انگریزی زبان میں ۱۸۳۲ء میں کیمبرج میں جے۔ جے۔ ایس۔

بیراؤن نے کیا۔

حریری بصری کی کتاب ''ملحتہ الاعراب'' کا ترجمہ شرح اور تعلیقات سمیت فرانسیسی میں ۱۹۰۴ء میں، پیرس میں ایل پنٹو نے کیا۔

کتاب ''الخزرجیہ'' کا ترجمہ متن سمیت فرانسیسی میں، ۱۹۰۲ء میں، الجزائر میں ریتی بیسیٹ نے کیا۔

٦۔ دیگر علوم

ہمارے امکان سے باہر ہے کہ ہم مسلمانوں کے علمی و تربیتی اقدامات اور جدوجہد نیز عالمی تمدّن پر ان کے ناقابل انکار اثرات سے متعلق کچھ بیان کرسکیں لہٰذا یہاں صرف چند اشاروں پر اکتفا کرنا ہی مناسب سمجھیں گے۔

فلسفہ، منطق، ریاضی، اجسام، کیمیا، طبیعیات، طب، نجوم، صنعت اور مشین سازی وغیرہ جیسے علوم وفنون کی دنیا میں مسلمانوں کی حیثیت موجد کی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی ان سے سابق نہیں، ان کے کارنامے حیرت انگیز ہیں جن میں سے ہر ایک کو ایک علمی اور تحقیقی کارنامہ کہنا چاہئے۔

یہ بات تو پورے اطمینان و وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ:

اقوام کے تمدّن وآداب کی معرفت کے سلسلے میں ابوریحان بیرونی کی ''الآثار الباقیۃ'' علوم کی تعداد شماری اور درجہ بندی کے سلسلے میں فارابی کی ''احصاء العلوم'' قرآنی علوم وادبیات کے موضوع پر سیوطی کی ''الاتقان'' فلسفہ وجود عرفانی کے موضوع پر ملا صدرا کی ''الاسفار'' حیوانات شناسی کے موضوع پر حافظ کی ''الحیوان'' تقابلی مطالعۂ فقہ کے موضوع پر شیخ طوسی کی ''الخلاف'' عالم کے بارے میں اسلامی رجحانات، ان کے دبستان واختلافات کے فلسفہ ومباحث پر سید مرتضیٰ کی ''الشافی'' کتاب شناسی کے موضوع پر ابن الندیم کی ''الفہرست''۔ عربی نحو کے موضوع پر سیبویہ کی ''الکتاب''، علمی مباحثات کے موضوع پر سید شرف الدین کی ''المراجعات''، روشنی اور شعاعوں کے موضوع پر ابن ہیثم کی ''المناظر''۔ ستاروں کی پہچان اور زیج کے سلسلے میں بتّانی کی ''الزیج الصابی'' فلسفہ میں ابن سینا کی ''الشفا'' مثلثات کے بارے میں خواجہ نصیر الدین طوسی کی ''شکل القطاع'' طب کے موضوع پر ابن سینا کی کتاب ''القانون'' فن تاریخ کے موضوع پر مسعودی کی ''مروج الذھب''۔ دائرۃ المعارف علوم کے موضوع پر طاشکبری زادہ کی ''مفتاح السعادۃ'' علم آبادکاری اور فلسفۂ تاریخ کے موضوع پر مقدمۂ ابن خلدون، استدلالی فقہ اور اقتصادیات کے موضوع پر شیخ انصاری کی ''مکاسب'' علوم کے لغت نامہ کے موضوع پر محمد بن احمد خوارزمی کی ''مفاتیح العلوم'' فخر الدین رازی کی ''جامع العلوم'' سراج الدین سکّاکی کی ''مفتاح العلوم'' اور قطب الدین شیرازی اور سیوطی کی ''درۃ التاج''، علمی اصطلاحات کے موضوع پر سید شریف جرجانی کی ''التعریفات'' اور محمد بن علی تھانوی کی ''کشاف اصطلاحات الفنون'' جغرافیہ کے موضوع پر حموی کی ''معجم البلدان'' دواؤں کی پہچان کے سلسلے میں ابن البیطار کی ''مفردات'' اور لغت واعلام میں زبیدی کی ''تاج العروس'' اور تفسیر واحادیث کے موضوع پر علامۂ

مجلسی کی ''بحارالانوار'' یہ سب مسلمانوں کی بیکراں کوششوں کے ایسے مشہور ومعروف نتائج اور شہہ پارے ہیں جو آج کے علوم جدیدہ کی ایجاد کا ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ہم ان تفصیلات سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ قرآن پر ایمان ویقین نے مومنین کے قلوب کو وہ جوش وولولہ اور تحرّک بخشا جس سے نہ صرف یہ کہ وہ تنہا مرکز ومحور قرار پائے بلکہ قرآنی تعلیمات کے سانچے میں انھوں نے اپنے کردار واعمال کو یوں ڈھال لیا کہ غیر مسلم افراد تیزی کے ساتھ ان کی عظمت کا اعتراف کر لیتے تھے، جہاں بھی ان کے قدم پہونچتے تھے وہاں کے باشندے دین اسلام کی طرف مائل ہوکر اس اس کے واقعی پابند ہوجایا کرتے تھے۔اگر آج کی دنیا میں پھر تمام مسلمان انھیں اسلامی آداب کو اپنا وطیرہ بنالیں تو نہ صرف یہ کہ وہ دم زدن میں دنیا کی تمام ایجادات واختراعات کے مالک بن جائیں گے بلکہ اسلامی تربیت کے ذریعہ پوری دنیا کو اسلام اور قرآن کی حقیقتوں سے روشناس کر کے خود ان کے روح رواں سمجھے جانے لگیں گے۔

آیئے! اس مقالہ کے اختتام پر ذرا اسلامی تعلیم وتربیت کے موضوع پر صدیوں قبل خواجہ نصیر الدین طوسی کی ایک کتاب کی چند فصلوں اوران کے عنوانات پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے چلیں اور یہ دیکھیں مسلمان ماہرین تعلیم اس نکتے پر کس قدر توجہ دیتے تھے کہ علم وعمل اور اخلاق وحکمت کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے پائیں۔خواجہ نے اپنی اس کتاب ''آداب متعلمین'' کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے، اوران کے عنوانات یہ قرار دیئے ہیں:

۱۔ علم کی حقیقت و ماہیت اوراس کی فضیلت۔
۲۔ حصول علم کے لئے خلوص نیت۔
۳۔ شعبۂ علم، استاد اور ہم درس کے انتخاب میں باریک بینی۔
۴۔ ضروری جدوجہد۔
۵۔ علم کی جمع آوری اوراس کے حصول کی مدّت۔
۶۔ زمانۂ طالب علمی میں توکل بخدا۔
۷۔ زمانۂ طالب علمی۔
۸۔ بخل اور حسد سے پرہیز۔
۹۔ وقت کی بربادی سے اجتناب۔
۱۰۔ تقویٰ کا ہونا۔
۱۱۔ حافظہ کی تقویت اور مطالب کو سمجھنے کا طریقہ۔
۱۲۔ صحت وتندرستی، کسب معاش کا جاری رکھنا، دین کے احکام کی پابندی اور حصول علم کے دوران صبر وقناعت۔

خواجہ طوسی آٹھویں باب میں اپنے نظریات کو ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں کہ: ''استاد کی نیت اور اس کا جذبہ یہ ہونا چاہئے کہ شاگرد خود اس کے دور اور اسی کے عہد میں ایک مشہور ومعروف عالم اور استاد بن جائے۔''

ہاں! سچ مچ یہی قرآنی تعلیمات ہیں، خداوندعزّوجل نے اپنی مقدس کتاب میں تزکیۂ نفس وحکمت وباریک اور تہہ تک پہنچنے اور سب کو بامقصد بنانے پر زور دیا ہے۔حق وصداقت ہے میرا پروردگار:

''ذٰلک الکتاب لاریب فیہ ہدیً للمتقین۔۔۔'' (البقرہ:۲)

حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

نام ونسب: حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی اولاد میں ایک فرزند اسحق کی اولاد سے بنی اسرائیل تھے جن میں حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰؑ ور بہت سے دوسرے پیغمبر ہوئے اور دوسرے فرزند اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹوں میں قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی تھی، جن میں عدنان سب سے زیادہ مشہور تھے۔ پیغمبرؐ اسلام ان ہی کی اولاد میں تھے۔

آپ کا نسب نامہ عدنان تک اس طرح ہے:-

محمد بن عبداللہ، بن عبدالمطلب، بن ہاشم، بن عبدمناف، بن قصی، بن کلاب، بن مرہ، بن کعب، بن لوی، بن غالب، بن فہر، بن مالک، بن نضر، بن کنانہ، بن خزیمہ، بن مدرکہ، بن الیاس، بن مضر، بن نزار، بن معد، بن عدنان۔

ان میں سے نضر بن کنانہ کی اولاد قریش کہلاتی تھی۔ حضرت کی والدہ آمنہ بنت وہب، بن عبدمناف، بن زہرہ، بن کلاب، بن مرہ تھیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ حضرت ماں اور باپ دونوں طرف سے قریش کے ممتاز قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ولادت: ۵۷۰ء میں جس سال ابرہہ حبشی نے خانۂ کعبہ پر ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ فوج کشی کی ہے جس سے عربوں نے عام الفیل کے نام سے سنہ مقرر کرلیا، اسی سال جمعہ کے دن ۱۷ ربیع الاول کو حجاز کی سرزمین مکہ پر حضرتؐ کی ولادت ہوئی۔

یتیمی: تاریخی حیثیت سے یہ معلم ہے کے حضرتؐ کے سر پر باپ کا سایہ دنیا میں باقی نہیں رہا، آپ کے والد جناب عبداللہ کا انتقال ہوگیا، اسی وقت جب آپ ابھی ماں کے پیٹ میں تھے یا پیدا ہونے کے بعد آپ دو مہینے یا سات مہینے کے تھے یا زیادہ سے زیادہ دو برس یا دو برس اور چار مہینے، یہ آخری مدت ہے، بہر حال مورخین میں اس کی تعین میں اختلاف ہے جس میں کوئی قابل اطمینان فیصلہ دشوار ہے۔ صورت حال کی حسرت خیزی اور بڑھ جاتی ہے اس کہ چھ سال کی عمر جب ہوئی تو شفیق ماں کا بھی سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ معلوم ہوتا ہے قدرت کی مرضی یہی تھی تمام عالم کو اپنی محبت وشفقت کے سایہ میں جگہ دینے والا خود باپ اور ماں دونوں کے سایۂ عاطفت سے کم سنی ہی میں محروم ہوجائے۔

تربیت: قبیلۂ بنی سعد میں سے حلیمہ وہ خوش قسمت خاتون تھیں جو رسولؐ اللہ کی رضاعت (دودھ پلانے) کے لئے مقرر ہوئیں اور اس دوران میں انھوں نے آپ کو اپنے گاؤں میں رکھا اس کے بعد چھ برس کے سن تک آپ اپنی والدہ گرامی کے ساتھ رہے۔ جب ماں کا بھی سایہ سر سے اُٹھ گیا تو آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کو اپنے پاس بلالیا اور اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت وشفقت کے ساتھ آپ کی پرورش شروع کی۔ مگر دو برس کے بعد جناب عبدالمطلب کی بھی وفات ہوگئی۔ انھیں اپنی زندگی کے آخری

لمحوں میں فکر تھی تو اس بچہ کی حفاظت ونگہداری کی جس کے متعلق انھیں یقین تھا کہ آگے چل کر دنیا کے سامنے اس کا بہت بڑا مرتبہ نمایاں ہوگا۔ اس لئے جب اپنی زندگی سے بالکل مایوسی ہوگئی تو انھوں نے اپنے فرزند ابوطالب کو بلا کر محمدؐ کو ان کے سپرد کر دیا، دوسرے بھائی سن میں ان سے بڑے موجود تھے، مگر عبدالمطلب کی نگاہ دور بین دیکھ رہی تھی کہ محمدؐ کے لئے جس طرح ابوطالب جاں نثاری کے ساتھ خدمت انجام دیں گے اس طرح کوئی دوسرا انجام نہیں دے گا۔

چنانچہ ابوطالب نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک ہر طرح کے سخت سے سخت اوقات میں محمد مصطفیٰ کی نصرت وحمایت میں اس عہد کو پورا کیا جو وہ اپنے بزرگ مرتبہ باپ عبدالمطلب سے ان کی اُکھڑی ہوئی سانسوں کی آخری آمدورفت کے عالم میں کر چکے تھے اور اس وقت سے کہ جب رسولؐ آٹھ برس کے تھے اپنی زندگی بھر رسولؐ کے ساتھ ان کے چچا ابوطالب وہ محبت صرف کرتے رہے جو اپنی اولاد کے ساتھ صرف نہ کرتے تھے اور چچی فاطمہ بنت اسد وہ شفقت کرتی تھیں جس سے رسولؐ کو ماں کی محبت کا لطف حاصل ہوجاتا تھا، اس لئے آپ نے خود فاطمہ بنت اسد کے انتقال موقع پر یہ لفظیں فرمائیں کہ ''یہ میری ماں کے بعد میرے لئے ماں کا درجہ رکھتی تھیں۔''

شام کا پہلا سفر: جب حضرتؐ کی عمر بارہ برس کی تھی تو ابوطالبؑ نے تجارت کے لئے شام کی جانب سفر کیا۔ اس سفر میں آپ بھی اپنے چچا کے ساتھ گئے اور اسی ذیل میں بحیرا راہب نے آپ کو دیکھ کر اُن آثار کی بنا پر جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں مذکور تھے، کہا کہ یہ بچہ نبی ہونے والا ہے اور اسے بڑا اقتدار حاصل ہوگا۔ یہ ملاقات بحیرا سے اثنائے راہ میں صرف تھوڑی دیر کے لئے ہوئی تھی، کوئی غلط روایت بھی اس کا پتہ نہیں دیتی کہ آپ نے وہاں کچھ عرصہ تک قیام کیا ہو۔

حلف الفضول میں شرکت: جب آپ کی عمر بیس سال کی تھی تو قریش میں حلف الفضول کا عہد نامہ ہوا کہ جو بے نظیر شریفانہ اصولوں پر مبنی تھا۔ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد قبائل عرب میں مطلق العنانی اور بے آئینی پیدا ہوگئی تھی، یہاں تک کہ پردیسیوں کے جان ومال مکہ میں محفوظ نہ رہے تھے۔ اس لئے بنی ہاشم کی دعوت پر زہرہ اور تیم کے قبیلے بھی متفق ہوئے اور سب نے عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوکر یہ عہد کیا کہ ''ہم ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک کہ اس کی شکایت رفع نہ ہوجائے اور ہم ایک دوسرے کی حق کوشی میں معاونت کریں گے۔'' اس معاہدہ میں حضرت محمد صلی مصطفیٰؐ نے بھی شرکت فرمائی۔ یہاں تک کہ ظہور اسلام کے بعد جب عرب کے دوسرے زمانۂ جاہلیت کے معاہدات کالعدم کر دیئے گئے تھے، تو بھی آپ اس معاہدہ کا اپنے کو پابند سمجھتے ہوئے فرماتے تھے کہ آج بھی اگر کوئی مجھے اس معاہدہ کی بنا پر آواز دے تو میں اس کی آواز پر لبیک کہوں گا۔

سفر تجارت: رسولؐ کی عمر پچیس سال کی تھی جب آپ خدیجہ بنت خویلد کے اموال تجارت کو لے کر شام کی طرف گئے۔ یہ تجارت کی مہم اتنی کامیابی کے ساتھ انجام پائی کہ جتنا نفع ہر سال خدیجہ کو ہوا کرتا تھا اس سے دونا نفع اس

سال ان کو حاصل ہوا۔

شادی: تجارتی معاملات کے ذیل میں رسولؐ کے محاسن اخلاق، امانت ودیانت اور بلندی ذات وصفات کا جناب خدیجہ کے دل پر نہایت گہرا اثر پڑ چکا تھا اور خود جناب خدیجہ کے حسن معاملت اور کردار کا رسولؐ خدا کی نظر میں وزن تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آپ کو جناب خدیجہ کے ساتھ شادی کے پیغام دینے کی طرف متوجہ کیا گیا تو آپ نے صرف یہ عذر فرمایا کہ خدیجہ کافی مالدار ہیں، میری اتنی مالی حیثیت نہیں ہے کہ میرے ساتھ وہ شادی پر تیار ہو سکیں لیکن درمیانی شخص نے جب ان کے رضامند ہونے کی ذمہ داری لی آپ نے بخوشی پیغام دینا پسند فرمایا وہی ہوا کہ جناب خدیجہ نے اُسے فوراً منظور فرمالیا، چنانچہ تاریخ عقد مقرر ہوئی جناب خدیجہ کی طرف سے ان کے چچا عمر بن اسد نے اور حضرتؐ کی جانب سے آپ کے چچا ابوطالب نے خطبۂ عقد اور ایجاب وقبول کے مراسم ادا کئے۔ باوجود یہ کہ جناب خدیجہ عمر میں حضرت سے کافی زیادہ تھیں مگر ان کے حسن سیرت کی آپ کی نظر میں اتنی عزت تھی کہ آپ نے ان کی زندگی میں کسی دوسری عورت سے عقد کا تصور بھی نہیں فرمایا۔

سیرت کی بلندی: بچپن سے جوانی تک کی زندگی کے تجربات نے عربوں پر یہ اثر کیا کہ انھوں نے متفقہ طور پر آپ کی راست بازی اور امانت داری کو تسلیم کرلیا اور آپ کو صادق اور امین کے القاب سے یاد کرنا اور اپنی امانتوں کو آپ کے پاس رکھوانا شروع کردیا۔ اس کے علاوہ اہم معاملات میں آپ کے مشوروں کو قابل قبول سمجھنے لگے۔

چنانچہ خانہ کعبہ کی مرمت کے موقع پر حجر اسود کے نصب کرنے کی عزت حاصل کرنے کی کوشش میں مختلف قبیلوں کے درمیان جو تنازع کی صورت ہوگئی تھی وہ آپ ہی کے حکیمانہ فیصلہ سے دور ہوئی اور سب نے اس کو بخوشی تسلیم کرلیا۔

بعثت: حضرت کی عمر چالیس برس کی تھی جب آپ ۲۷ ررجب کو تبلیغ رسالت کے فریضے پر مامور ہوئے اور عملی طور پر خداوندی پیغام کے حامل قرار پائے، آپ نے بحیثیت رسول اپنے پیغام کو سب سے پہلے اپنی رفیقۂ حیات خدیجہ بنت خویلد تک پہونچایا، جس پر وہ سچے دل سے ایمان لائیں اور آپ کے چچا زاد بھائی علی ابن ابی طالبؑ جو برابر آپ کے ساتھ رہتے تھے اور آپ کی رسالت کی عظمتوں کے پہلے سے عینی شاہد تھے۔ آپ کے دعوائے رسالت کے سب سے پہلے گواہ بنے۔ پھر روز بروز دوسرے افراد تک بھی یہ آواز پہونچتی گئی اور اِکّا دُکّا لوگ آپ کے دعوے پر ایمان لاتے رہے۔ مگر ابھی تک تبلیغ رسالت رازداری کے ساتھ خاص خاص لوگوں کے سامنے کی جاتی تھی اور علی الاعلان اپنی آواز کو بلند کرنے کا موقع نہ آیا تھا۔ جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے، انھیں بھی حکم یہی تھا کہ وہ مخفی طور پر اپنی مذہبی فرائض انجام دیں اور اس کی عام اشاعت نہ کریں۔

دعوت عشیرہ: تین برس اس طرح رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا ہونے کے بعد دوسری منزل یہ تھی کہ اپنے قریبی عزیزوں کے مجمع میں اعلان کا حکم آیا۔ آپ نے حضرت علی بن ابی طالبؑ کو حکم دیا کہ دعوت کا سامان کرو، چنانچہ سامان دعوت کیا گیا اور اس میں تمام قریش کے ممتاز

افراد کو مدعو کیا گیا سب جمع ہوئے۔ کھانے کے بعد حضرتؐ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں وہ چیز لے کر آیا ہوں، جو دنیا اور آخرت دونوں میں بہتری کی ضامن ہے۔ میں خلق خدا کو توحید اور اصلاح عمل کی طرف بلانے پر مامور ہوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس مہم میں میرا ساتھ دے گا، تا کہ وہی میرا رفیق، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہو۔ مجمع میں ایک سناٹا سا چھا گیا، کسی نے کچھ جواب نہ دیا، مگر بس ایک جوان بخت بچہ تھا جو اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا میں آپ کا اس مہم میں دست و بازو ہوں گا، یہ علی بن ابی طالبؑ تھے جو عملی طور پر پہلے ہی سے رسولؐ کے بازو بنے ہوئے تھے اور اب اس طرح وہ تمام مجمع کے سامنے بھی عہد وفاداری کر رہے تھے۔ پیغمبرؐ نے علیؑ کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا، اور کہا کہ بس یہ میرا رفیق، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔

مصائب و شدائد: رسولؐ نے قریش کے سامنے علانیہ بُت پرستی کی مذمت اور خدا پرستی کی تبلیغ شروع کر دی۔ قریش آپؐ کی ایذا رسانی پر آمادہ ہوئے مگر ابوطالب کی شخصیت سے جو آپ کی محافظ تھی وہ مجبور ہو رہے تھے، آخر ان میں کے جو ممتاز افراد تھے وہ مل کر ابوطالبؑ کے پاس آئے اور بہت تلخ الفاظ میں رسولؐ کی شکایت کی اور کہا کہ یا تو اپنے بھتیجے کو روکیے یا آپ درمیان سے ہٹ جایئے ہم ان سے سمجھ لیں گے۔ ابوطالبؑ نے حضرتؐ سے اس کا تذکرہ کیا، آپؐ نے فرمایا کہ یہ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں کلمۂ حق سے خاموش نہیں ہو سکتا، ابوطالبؑ نے ان لوگوں کو صاف جواب دے دیا جس سے ان کی عداوت کا شعلہ اور زیادہ بھڑک گیا اور خصوصیت کے ساتھ ان غریب مسلمانوں کو بہت تکلیف پہونچانے لگے جنھوں نے رسالت پیغمبرؐ پر ایمان قبول کیا تھا۔

ہجرت اولیٰ: بعثت کے پانچویں سال مسلمانوں پر مظالم بہت ہونے لگے تو آپ نے اپنے اصحاب کو ملک حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی ہدایت فرمائی، چنانچہ کافی تعداد میں مسلمان حبشہ کی طرف روانہ ہوئے، ان مہاجرین کے سر گروہ جعفر بن ابی طالب تھے جنھوں نے بہترین طریقہ پر عیسائی بادشاہ کے دربار میں اسلامی تعلیمات کی ترجمانی اور تبلیغ کا بھی فرض انجام دیا۔ جس سے بادشاہ اور ارکان سلطنت کے دل پر اسلامی عظمت کا سکہ جم گیا اور مسلمانوں کو وہاں اطمینان و سکون کے ساتھ قیام کا موقع ملا۔

محاصرہ: حبشہ میں مسلمانوں کی کامیابی کے حالات کو سن کر مشرکین کے بغض و حسد میں اور ترقی ہوئی اور انھوں نے آپس میں متفق ہو کر یہ طے کیا کہ بنی ہاشم کا پورے طور پر بائیکاٹ کیا جائے، نہ صرف یہ کہ ان کے ساتھ شادی بیاہ جائز نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے ساتھ خرید و فروخت بھی نہ کی جائے، یہاں تک ضروریات زندگی پانی اور کھانا تک پہونچنے نہ دیا جائے۔ ناچار ابوطالبؑ نے رسولؐ کو اپنے ایک محفوظ مکان میں جو پہاڑ کی گھاٹی میں ایک قلعہ کی صورت پر تھا منتقل کر دیا۔ یہ واقعہ رسالت کے ساتویں سال کا ہے اور تین برس مسلسل یہ محاصرہ قائم رہا۔ اس دوران میں حضرت رسولؐ خدا اور آپ کے ساتھ تمام بنی ہاشم کو سخت تکالیف و شدائد کا مقابلہ کرنا پڑا یہاں تک کہ کئی کئی وقت ایسے گزر جاتے تھے کہ آب و طعام میسّر نہ آتا تھا، تین برس کے بعد یہ

بائی کاٹ ختم ہوا اور یہ لوگ قلعہ سے باہر نکل سکے۔

دو بڑے صدمے: افسوس ہے کہ اس محاصرہ کے ختم ہونے سے دو ہی مہینے کے بعد بعثت کے دسویں سال ابوطالبؑ کا اور ان کے صرف پینتیس دن بعد جناب خدیجہ بنت خویلد کی وفات ہوگئی۔ ان دونوں آدمیوں کی رحلت کا رسولؐ اللہ کو شدید صدمہ پہونچا اسی سے آپ اس سنہ کو ''عام الحزن'' (رنج کا سال) فرمایا کرتے تھے۔

طائف کا سفر: ابوطالبؑ کے بعد قریش کی ایذا رسانی بہت بڑھ گئی وطن کی زمین رسولؐ کے لئے خارزار بن گئی۔ آپ کو اسلام کی اشاعت کے لئے اب کسی مناسب مقام کی تلاش بھی تھی، چنانچہ آپ نے بعثت کے دسویں برس کے آخر میں ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک داعی حق کی حیثیت سے طائف کا سفر کیا۔ بالکل بے زاد و بے توشہ صرف زید بن حارثہ کو ساتھ لئے ہوئے آپ نے عرب کے اس سرسبز مقام پر دس دن قیام کیا اور فرداً فرداً اسلام کا پیغام ہر ایک تک پہونچایا مگر افسوس کہ ہدایت کی کھیتی کے لئے یہ شاداب زمین بھی اوسر ثابت ہوئی نہ صرف یہ کہ ان لوگوں نے آپ کی آواز پر لبیک نہیں کی بلکہ اپنے یہاں ٹھہرنے بھی نہیں دیا اور جسم مبارک پر پتھر مارنا شروع کئے آپ پھر مکہ معظّمہ واپس آئے مگر یہ تمام مشکلات آپ کے قدم کو راہ حق میں مسلسل کوشش سے باز نہ رکھ سکے۔

انصار کی ملاقات: مکہ معظّمہ میں ہر سال مجنہ اور عکاظہ کے جو بازار لگتے تھے اور ان میں مختلف اطراف وجوانب کے قبائل جمع ہوتے تھے، اس موقع پر شعرائے عرب اپنے قصیدے سناتے تھے، تجار اپنے اموال تجارت لاکر فروخت کرتے تھے اور رسولؐ کا کام یہ تھا کہ آپ قبائل عرب کے سامنے اپنے پیغام توحید کو پیش کرکے ان کو اپنی حمایت ونصرت کی دعوت دیتے تھے مگر دعوت حق کی آواز اُن ہی دلوں پر اثر کیا کرتی ہے جن میں کسی حد تک صلاحیت وقبول کی روشنی موجود ہوتی ہے۔

جب کہ اکثر قبائل بجائے وعدۂ نصرت کے حضرتؐ کی باتوں کا مذاق اُڑاتے تھے اور ایذا رسانی پر آمادہ ہوتے تھے۔ یثرب کی سرزمین کی ایک جماعت خوش قسمتی سے اس صدا سے متاثر ہوگئی۔ اور انھوں نے عقیدۂ حق کو قبول کرکے آپؐ کی امداد ونصرت کا وعدہ کرلیا۔ یہ تھا انصار کا پہلا گروہ جو شرف اسلام سے مشرف ہوا اور پھر انھوں نے اپنے شہر جاکر رسولؐ کا پیغام پہونچایا اور بہت سے افراد نے غائبانہ آپ پر ایمان اختیار کیا۔ دوسرے سال ان میں کے بارہ آدمی رسولؐ سے آکر ملے اور آپ سے عقائد اسلامیہ کی تعلیم حاصل کی اور تیسرے سال ستر آدمیوں نے حاضر ہوکر اس سعادت کو حاصل کیا۔ اب مدینہ میں اسلام کافی طور پر پھیل گیا اور لوگ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے جن میں سے اکثر صرف تعلیمات اسلامی سے متاثر ہوکر اس سعادت کو حاصل کررہے تھے اور ابھی ان کو آنکھوں سے رسولؐ کے چہرۂ مبارک کی زیارت نصیب نہ ہوئی تھی۔

مدینہ کی طرف ہجرت: یثرب میں اسلام کی کامیابی کی خبر سن کر اہل مکہ کا غیظ وغضب بڑھتا جاتا تھا اور وہ اب مسلمانوں کو اور زیادہ ناقابل برداشت تکلفیں پہونچانے

لگے۔ آخر رسولؐ خدا نے ان کو یثرب کی جانب ہجرت کی اجازت دی اور رفتہ رفتہ اکثر مسلمان مکہ سے نکل گئے۔ صرف رسولؐ خدا، علی مرتضیٰ اور چند دوسرے مسلمان باقی رہ گئے اب مشرکین کو یقین ہو گیا کہ رسالت مآبؐ کے لئے یثرب میں ایک محفوظ جائے پناہ حاصل ہو گئی ہے اب عنقریب یہ خود بھی وہاں پہونچ جائیں گے تو ہمارے مقابلہ میں ان کو بڑی طاقت حاصل ہو جائے گی، اس لئے دارالندوہ میں جمعہ ہو کر آپس میں مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ رات کے وقت آپ کے گھر کو گھیر کر آپ کے چراغ زندگی کو خاموش کر دیا جائے۔

حضرت رسولؐ کو اس کی اطلاع پہونچ گئی اور آپ نے طے فرما لیا کہ آپ اپنے بستر پر علی بن ابی طالب علیہ السّلام کو لٹا کر خود مخفی طریقہ سے زمین مکہ چھوڑ کر مدینہ کی طرف روانہ ہو جائیں گے، چنانچہ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے اپنے کو خطرے میں ڈال کر رسولؐ کے بستر پر آرام کیا اور حضرتؐ دشمنوں کی نگاہوں سے مخفی رہ کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس اہم واقعہ کو ہجرت کہتے ہیں اور اسی سے مسلمانوں میں ہجری تاریخ کی ابتدا ہوئی ہے۔

مسجد نبوی کی تعمیر: سب سے پہلا کام جو رسولؐ نے مدینہ پہونچ کر کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھی جس میں تمام مسلمانوں کے ساتھ خود رسولؐ بھی پتھر اُٹھا اُٹھا کر لانے میں شریک تھے۔ شروع شروع میں بس ایک قد آدم اونچی چار دیواری پر اکتفا کی گئی۔ پھر جب نمازیوں کو گرمی سے تکلیف ہوئی تو شاخہائے درخت کا ایک سائبان ڈلوا دیا۔ لیکن چھت باوجود اصحاب کے اصرار کے بنوانا پسند نہیں فرمائی۔ اس مسجد کے گرد چھوٹے چھوٹے مکانات اپنے اعزا اور ضرورت مند اصحاب کے لئے بنوائے جن کے دروازے پہلے مسجد ہی میں کھلتے تھے، مگر بعد کو سوائے حضرت علی بن ابی طالبؑ کے اور سب کے دروازے مسجد کی طرف کے بند کر دیئے گئے اور آمد و رفت باہر سے قرار دے دی گئی۔

جہاد: جب قریش کو معلوم ہوا کہ رسولؐ بخیر و خوبی مدینہ پہونچ گئے اور ان کا مذہب دن دونی ترقی کر رہا ہے، تو ان کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی اور وہ مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ مل کر کوششیں کرنے لگے کہ اس بڑھتی ہوئی طاقت کو کچل دیں، اس کے نتیجہ میں حضرتؐ کو مشرکین قریش اور یہودیوں کے ساتھ بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں، جن میں سے اہم موقعوں پر حضرت خود فوج اسلام کے ساتھ تشریف لے گئے۔ ایسی مہموں کو ''غزوہ'' کہتے ہیں اور جن موقعوں پر آپ اپنے اصحاب میں سے کسی کو فوج کا سردار بنا کر بھیج دیا کرتے تھے ان کو ''سریہ'' کہا جاتا ہے، غزوات کی مجموعی تعداد چھبیس ہے، جن میں بدر واحد، خندق، خیبر اور حنین بہت مشہور ہیں اور سریوں کی تعداد چھتیس تھی جن میں سب سے مشہور جنگ موتہ ہے جس میں جعفر طیار شہید ہوئے۔

صلح حدیبیہ: بدر واحد کی لڑائیوں کے بعد کچھ عرصہ تک مشرکین مکہ کی طرف سے کوئی جنگی کاروائی نہیں ہوئی، تو ہجرت کے چھٹے سال حضرت نے مکہ معظّمہ کے حج کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے مگر جب قریشیوں کو رسولؐ کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ مکہ سے باہر نکل کر رسول کا راستہ روکنے پر تیار ہوئے اور

انھوں نے کہا کہ ہم اپنی آنکھوں سے آپ کا شہر مکہ میں ورود نہیں دیکھ سکتے۔ مکہ والوں کا یہ جارحانہ اقدام دیکھ کر رسولؐ نے امن پسندی سے کام لیتے ہوئے ان کے ساتھ ایک تحریری صلح نامہ کرلیا۔ اس صلح کے کاتب حضرت علی بن ابی طالبؑ تھے۔ اس کے شرائط حسب ذیل تھے:

(۱) رسولؐ اس سال مع اپنے متبعین کے بغیر حج کیے ہوئے واپس جائیں۔

(۲) دس سال تک آپس میں کوئی جنگ نہ ہو۔

(۳) اگر مکہ والوں میں سے کوئی جا کر مسلمانوں میں شامل ہوجائے تو مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اسے واپس کردیں۔

(۴) اگر کوئی مسلمان بھاگ کر مشرکین کے پاس آجائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

(۵) عرب کے تمام قبیلوں کو اختیار ہے کہ چاہے وہ رسولؐ اسلام کے ساتھ معاہدہ کرلیں یا مکہ والوں کے ساتھ ہوجائیں۔

(۶) آیندہ سال مسلمانوں کو مکہ کی زیارت کا حق حاصل ہوگا، لیکن وہ وہاں تین روز سے زیادہ قیام نہیں کرسکیں گے۔

(۷) مسلمان اس موقع پر اپنے سفری اسلحہ کے ساتھ یعنی تلواروں کو غلاف میں رکھ کر آسکیں گے۔

بعض مسلمان اس معاہدہ کے غیر منصفانہ شرائط پر بڑی ناراضگی کا اظہار کررہے تھے، مگر حضرت رسولؐ نے اس لئے کہ جارحانہ حملہ کا الزام آپ پر عائد نہ ہو، ان شرائط پر صلح کر کے مکہ سے واپسی اختیار کی اور دوسرے سال معاہدہ کے مطابق حج کے لئے تشریف لے گئے اور حسب معاہدہ تین دن کے بعد مکہ کو چھوڑ دیا اور مدینہ واپس چلے گئے۔

فتح مکہ: کچھ ہی عرصہ کے بعد مکہ والے اس معاہدہ پر جو رسولؐ اللہ کے ساتھ کیا گیا تھا قائم نہیں رہے اور قبیلۂ خزاعہ کو جو پیغمبرؐ اسلام کا حلیف تھا بکر کے قبیلہ نے جو مشرکین کا حلیف تھا تہہ تیغ کردیا جب حضرت کو یہ معلوم ہوا تو آپ اپنے حلیف قبیلہ کی امداد کے لئے فوراً روانہ ہوگئے اور دس ہزار مسلمانوں کی فوج کے ساتھ مکہ کے قریب پہونچ کر خیمہ زن ہوئے۔ مشرکین میں اب مقابلہ کی طاقت باقی نہ تھی انھوں نے ہتھیار ڈال دینا مناسب سمجھا اور ماہِ رمضان ۸ھ میں آپ فاتحانہ شان سے مکہ معظّمہ میں داخل ہوئے، اب پیغمبرؐ اسلام کا رحم وکرم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ ان لوگوں کو جن سے آپ کو سخت تکلیفیں پہونچی تھیں، جن کی وجہ سے آپ کو اپنا وطن عزیز چھوڑنا پڑا تھا، فتح مکہ کے وقت تمام خطائیں معاف کردی گئیں۔ فتح کے موقع پر جب لوگ آپ کی بیعت کررہے تھے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ تم مجھ سے کیا امید رکھتے ہو، سب نے جواب دیا کہ ہمیں اچھائی کی امید ہے۔ آپ فیاض بھائی ہیں اور فیاض بھائی کے فرزند ہیں۔ آپ نے فرمایا جاؤ تم لوگ آزاد ہو۔

دنیا کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ رسولؐ خدا نے ابوسفیان کو، اس کی بیوی ہندہ کو جس نے حضرت حمزہ کی شہادت کے بعد ان کا کلیجہ نکلوا کر چبایا تھا وحشی کو جس نے حضرت حمزہ کو شہید کیا تھا، عکرمہ ابوجہل کے

بیٹے اور ایسے ہی کئی اشخاص کو جنھوں نے سخت ایذائیں پہونچائیں تھیں اور شدید جرائم کے مرتکب ہوئے تھے، آج ظاہری اسلام قبول کرنے کے بعد بغیر کسی شرط کے معاف کردیا۔ فتح کے بعد حضرتؐ نے ڈیڑھ ماہ مکہ میں قیام فرمایا اور ملکی انتظام کے لئے وہ اصول جاری کئے جو مہذب قوموں کی تہذیب کی آج بھی نشانی بن سکتے ہیں۔

حجۃ الوداع: ۱۰ھ میں حضرتؐ نے اپنی زندگی کا آخری حج کیا۔ ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ بڑی شان وشوکت کے ساتھ ارکان حج ادا کئے۔

واپسی میں مقام غدیر خم پر تمام اطراف وجوانب کے مسلمانوں کے مجمع میں یادگار تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں آپ نے اپنی وفات کے قریب ہونے کی دردناک خبر سناتے ہوئے ان سے اس طرح اقرار لیا کہ میں تمہارے بارے میں خود تم سے زیادہ اختیارات رکھتا ہوں یا نہیں؟ جب سب نے تسلیم کیا کہ بے شک آپ ہم پر ہم سے زیادہ اختیارات رکھتے ہیں، تو آپ نے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کے سامنے اونچا کیا اور فرمایا کہ جو اختیارات مجھے تمہاری نسبت حاصل ہیں وہی علی کو تمہاری نسبت حاصل ہوں گے اس طرح آپ نے اپنے بعد کے لئے اپنے جانشین کے نام کا اعلان فرمایا۔ مسلمانوں نے اس پر بڑی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا اور عام طور سے اس وقت علیؑ رسولؐ کے جانشین تسلیم کر لئے گئے۔

اصول تعلیم اور اخلاق وخصائل: پیغمبرؐ اسلام کی تعلیم کا خاص جوہر تمام افراد انسانی کی نگاہ کو مادیت کے احاطہ سے نکال کر ایک غیبی طاقت کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے ہیں، خالق کی توحید اور خلائق کا اتحاد یہ ہی دو وہ بنیادی اصلیں تھیں جن پر حقوق اللہ اور حقوق الناس کی عمارت بلند ہوئی اور تاریخ انسانی میں پہلے پہل شہری اور انسانی حقوق پورے طور پر عام انسانوں کو بالعموم عطا ہوئے جن سے وہ قومیت، رنگ، جنس یا غربت وفلاکت کی بنا پر محروم رکھے جاتے تھے اس نے پہلے کے تمام تفوق اور بلندی کے امتیازات مٹا کر ایک نیا امتیاز کا معیار قائم کیا اور وہ یہ کہ افضلیت اعمال وافعال کی بناء پر حاصل ہوتی ہے۔ جو شخص فرائض انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے۔

اخلاق پر بہت زور دیا، حضرتؐ فرماتے تھے کہ ''میں بھیجا گیا ہوں صرف اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے'' آپ کے ذاتی اخلاق وخصائل بھی اسی مقصد کے ترجمان تھے آپ اتنی بڑی اسلامی جماعت کے سردار ہوتے ہوئے فقرائے مدینہ کے ساتھ زانو سے زانو ملا کر بیٹھتے اور ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوجاتے تھے، رات رات بھر عبادت خدا ہوتی تھی اتنی کہ پیروں پر ورم آجاتا تھا اور دن بھر قبائل عرب اور مختلف شہروں کے وفود سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مسائل کا تصفیہ ہوتا تھا اور بڑے بڑے قضیے حل کئے جاتے تھے، ایک انگریز مؤرّخ (باسورتھ اسمتھ) نے لکھا ہے کہ ''تاریخ میں محمدؐ کی سی ہستی بیک وقت تین فرائض انجام دیتی ہوئی نہیں مل سکتی یعنی کہ محمدؐ ایک قوم کے بانی ہوئے،

ایک نئے نظام سلطنت کے بانی ہوئے اور ایک مذہب کے بانی ہوئے ہیں۔ ایسی مثال کوئی دوسری نہیں مل سکتی۔'' اس کے ساتھ آپ نے کبھی اپنے کو بادشاہ کہا جانا یا سمجھا جانا پسند نہیں کیا بلکہ اس سے انکار فرمایا۔

ایک مرتبہ ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا جوں ہی آپ کے سامنے کھڑا ہوا، رعب سے کانپنے لگا، آپؐ نے فرمایا ''اپنے آپے میں آؤ، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں، جو شوربے میں روٹی کو چورا کرکے (غریبا مئو) کھانا کھاتی تھی، اسی مناسب سے آپ کی عادتیں نہایت سادہ تھیں۔ تعمیر کے وقت مزدوروں کی طرح کام کرتے، بازار سے اپنا سودا خرید کر لاتے بلکہ ہمسایوں کو بھی خرید کر لا دیتے تھے، عفو و کرم آپ کا خاصہ اور سختیوں کو ہمت کے ساتھ برداشت کرنا اور عزم و اطمینان کے ساتھ عمل کے جادہ پر قائم رہنا آپ کی سیرت میں نمایاں تھا۔

آپؐ کا عمل آپ کی تعلیم کا مفسر اور آپ کی تعلیم آپ کے عمل کا خلاصہ تھی۔ آپ کے طرز بیان کی خاص خصوصیت جامعیت تھی۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں آپ نے وہ اصول ودیعت کر دیئے ہیں جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرتے ہیں۔

قرآن مجید: قرآن حقائق و معارف کا وہ خزانہ اور حیات انسانی کا وہ مکمل دستور ہے جو آپ کے ذریعہ سے اہل عالم کی ہدایت کے لئے پیش ہوا اور کروڑ در کروڑ انسانوں نے اس وقت سے اب تک اس کے تعلیمات سے فیض حاصل کیا اور ہزاروں ایسے افراد نے بھی جو مذہبی طور سے اس پر ایمان کا اقرار نہیں رکھتے اس کی بلندی کا اعتراف کیا ہے۔

وفات: دوشنبہ کا دن دوسری ربیع الاول ۱۱ھ یا ایک قول کی بنا پر ۲۸ رصفر کی وہ قیامت خیز تاریخ تھی، جب چند روز بیمار رہنے کے بعد مصلح عالم پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ آپ کی حسب وصیت آپ کے بھائی اور جانشین حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے آپ کی تجہیز و تکفین فرمائی اور آپ کی مسجد کے پاس اسی حجرہ میں جہاں آپ کی وفات ہوئی تھی دفن کیا۔

مدینہ منورہ میں آپ کا قبۂ خضراء مسلمانان عالم کی زیارت گاہ ہے، جہاں وہ مکہ معظّمہ کے حج سے پہلے یا بعد جاتے ہیں اور مسجد نبویؐ و روضہ رسولؐ کی زیارت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

اخلاق

امام صادق علیہ السلام کی نگاہوں میں

حجۃ الاسلام جناب محمد امین زین الدین صاحب
ترجمہ۔ جناب مولانا ممتاز علی صاحب

فکر کے لئے نقد ونظر اور بیان کے لئے توضیح اور تصویر کشی لازمی ہے لیکن حق کے لئے ان دونوں سے بالاتر ایک حکومت عادلہ ہوتی ہے جو صاحب بصیرت کو نور ہدایت اور دلیل و حجت عطا کرتی ہے لیکن کسی بھی مصنف پر تصویر کشی سے پہلے فکر ونظر کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

قلم کار جب انسانیت کی کسی عظیم شخصیت پر قلم اُٹھاتا ہے تو اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوت نظر کو گہرائیوں تک لے جائے اور اس سے پہلے صحیح علم سے رہنمائی حاصل کرے اور دلیل حق قائم کرلے خصوصاً ایسی شخصیتوں پر قلم اٹھانے سے پہلے بڑی زحمت ہوتی ہے جو تاریخ کا معجزہ ہیں۔۔۔۔۔ جیسے امام جعفر صادق علیہ السلام۔۔۔۔۔۔ ایسے موقع پر اگر علم صحیح انسان کی رہنمائی نہ کرے تو بہت سے رموز واسرار سدّ راہ ہوسکتے ہیں۔

جب میں نے امام جعفر صادقؑ پر قلم اُٹھانے کی کوشش کی تو مجھے عجیب سا محسوس ہوا، معلوم ہوتا تھا جیسے قلم ہاتھ سے چھوٹ جائے گا اور الفاظ ہونٹوں پر دم توڑ دیں گے۔ جب غیر محدود وآفاق میں محدود فکر بشر پرواز کی کوشش کرتی ہے تو ایسی ہی کمزوریاں اس کے آڑے آتی ہیں جب مصوّر لامتناہی شعاعوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے تو حیرت میں پڑجاتا ہے۔ فکر بشر اس بات کی تعیین نہیں کرپاتی کہ غیر محدود آفاق سے کسی چیز کو تجزیہ وتحلیل کے لئے مخصوص کرے۔ مصوّر سوچنے لگتا ہے کہ ان شعاؤں میں سے کن کرنوں کو چن لیا جائے جس سے ایک منفرد تصویر ابھر کر سامنے آسکے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہی کیفیت میری بھی تھی، میں سوچ رہا تھا کہ امام جعفر صادقؑ کی لامحدود شخصیت کا کون سا گوشہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کروں، اس لئے کہ آپ کی زندگی کا ہر حصہ لائق توجہ اور ہر رخ تجزیہ وتحلیل کے قابل ہے۔ آپؑ کی زندگی کا ہر گوشہ علم اور ہر خاصیت اپنی جگہ خود ایک اعجاز ہے۔

علم اخلاق وہ علم ہے جو نفس بشر کے کمالات کو ابھارتا ہے۔ عقل انسانی کی قوت واستقلال میں اضافہ اور اس کی دست گیری کرتا ہے، جب وہ کمزور ہونے لگتی ہے تو اس کو قوت وطاقت عطا کرتا ہے علم اخلاق ایک۔۔۔۔۔ پیغام عام۔۔۔۔ ہے اور ہر انسان کا فریضہ ہے کہ وہ اس پیغام کو

دوسروں تک پہنچائے۔

علم اخلاق ایک عظیم امانت ہے اور اس امانت کو ایک عاقل کا دوسرے عاقل تک منتقل کرنا ضروری ہے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے سلسلے میں گفتگو کرنے کے لئے علم اخلاق کے موضوع کو اختیار کیا ہے۔ یوں تو آپ کی کوئی خصوصیت ایسی نہیں ہے جو ممتاز نہ ہو لیکن علم اخلاق کو خصوصی عنایت حاصل ہے اور یہی مخصوص عنایت میری توجہ کا مرکز بنی اسی عنایت کی وجہ سے آپ سے نقل ہونے والا ہر لفظ اور آپ کی طرف منسوب ہر حدیث علم اخلاق پر ایک اچھا اثر مرتب کرتی ہے۔

ہم نے اس موجودہ بحث میں خود امام علیہ السلام کے اخلاق کو موضوع نہیں بنایا ہے۔ اس لئے کہ یہ موضوع تو اس کا ہے جو خود امام علیہ السلام کی عظمت و شخصیت پر گفتگو کرنا چاہے۔ لیکن جو صرف ان کی علمی عظمت بیان کرنا چاہتا ہو اس کے لئے ضروری ہے وہ اس بات کو موضوع بنائے کہ۔۔۔۔ اخلاق کی حیثیت امامؑ کی نظر میں کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔؟ یہ اور بات ہے کہ اخلاق کا اس حیثیت سے جائزہ لینے کے بعد اکثر مقامات پر آپ کی عظمت خود بخود اُبھر کر سامنے آجائے گی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اخلاق کے سلسلے میں فلسفیوں کے کلام سے استفادہ نہیں کیا ہے، بلکہ آپ کے کلام کا سرچشمہ وحی اور قرآن ہے۔ حقیقی فلسفہ وحکمت کی باتیں تو اصل میں قرآن اور ارشادات محمدؐ وآل محمد علیہم السلام کی ضیا پاشی کا نتیجہ ہیں۔ جو شخصیتیں شبستان محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں زندگی گذاریں اور ارشادات پیغمبرؐ کی چھاؤں میں جن کا اُٹھنا بیٹھنا ہو وہ ارسطو اور افلاطون جیسے فلسفیوں کے افکار سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ انہیں فکر کے تانہ بانہ میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

یہ اسی گھرانے کی خصوصیت ہے کہ ایک ہی طرح کی حدیثیں اکثر اماموں سے لفظی اور معنوی حیثیت سے مروی ہیں اور بعینہ وہی بات پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کہی ہے ایسا لگتا ہے جیسے سب ایک ہی نور کی کرنیں ہیں۔

اخلاق انسانیت کا ایک اہم ترین رخ ہے جس کی طرف بار بار دین اسلام نے متوجہ کیا ہے، نیز اخلاق انسانی استوار کرنے کے لئے بڑے اہتمام سے کام لیا ہے۔ قرآن اور حدیثوں کا مطالعہ کرنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اسلام نے اخلاقیات کے اوپر کتنا زور دیا ہے۔ یہ دین اسلام کی وہ خصوصیت ہے جو اس کو دوسرے تمام ادیان سے نہ صرف ممتاز کرتی ہے بلکہ اس کی بقا کی بھی ضامن ہے۔

جب اخلاق غلط ماحول اور تربیت کی وجہ سے تباہ ہونے لگیں، جب انسانی عادتیں بگڑنے لگیں، جب امراض روحانی قوم کی معنویت کو نقصان پہونچانے لگیں اور خیر و سعادت پر اثر انداز ہو تو دین اور مصلح کی ذمہ داری ہے کہ وہ قوم کے اخلاقی نقائص کو دور کرے اور انسانی نفس میں جو خلاء اس مرض کی بنا پر پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی نشان دہی کرتے ہوئے اس وبائی مرض کو رفع کرے تا کہ وہ فرد قوم کا ایک صالح جزو بن کر ایک ایسا بہترین معاشرہ تشکیل دینے میں معاون ہو جو خیر کے راستہ کی طرف گامزن ہو جائے۔

اسلام ایک فردی اجتماعی دین ہے۔ نبی اسلام جس

طرح معاشرہ کی سعادت اور اصلاح کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح وہ فرد کی سعادت اور اصلاح کا بھی ضامن ہے۔ وہ صرف سماجی کی تنظیم کی کوشش نہیں کرتا بلکہ فرد کو بھی مہذب بنانے کے اصول بتاتا ہے چوں کہ معاشرہ کی اصلاح کے لئے فرد کا صالح ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے دین اسلام نے فرد کی سعادت کا جو اہتمام کیا ہے اس کے دو رخ رکھے ہیں۔

ایک جانب تو وہ افراد کی سعادت کا اہتمام اس انداز سے کرتا ہے کہ اس پر چل کر ہر فرد ذاتی طور پر منزل کمال تک پہونچ سکے۔

اس اہتمام کا دوسرا رخ یہ ہے کہ فرد فقط اپنی ذات تک اس کمال کو محدود نہ رکھے بلکہ ایک صالح معاشرہ بنانے میں معاون ثابت ہو۔۔۔۔۔۔لہٰذا دین اسلام کو "دین اخلاق" کہنا نہایت ہی موزوں ہے اور اس کے رہبروں کے لئے بھی لازم ہے کہ ان میں روح اخلاق موجود ہو۔۔۔۔امام جعفر صادق علیہ السلام ان ہی رہبروں میں سے ایک رہبر تھے۔

فلسفہ اخلاق یوں تو قدیم تہذیب کی میراث کا ایک جزو ہے۔ اور انسانوں نے جب بھی وجود کے فلسفہ پر بحث کی ہے تو فسلفہ اخلاق کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے۔ چوں کہ انسان اس بات کو جانتا تھا کہ نفس بشری وجود کی ایک اہم فرد ہے اور اخلاق نفس، بشر کے عظیم اجزاء اور خواص ہیں لہٰذا اس نے بحث اخلاق میں ایک طویل مدت تک بڑی کوشش کی ہے اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلا ہے۔

لیکن جب ہم عرب کے جاہلی دور کو دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس فلسفہ کو سننے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کی۔ فلسفۂ اخلاق صرف چند فلسفیوں کی میراث اور چند شعراء کے افکار کی زینت بنا رہا۔

لیکن دین اسلام جس نے ان ہی عربوں کے درمیان نشو ونما پائی اور حضرت رسول اکرم محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کی تعلیمات کو پیش فرماتے رہے۔ اس نے علم اخلاق کو کئی جہتوں سے پیش کیا اور اس کے کچھ قواعد وضوابط بھی مقرر کئے، ایسے قواعد جو مختلف زمان ومکان کے لئے مفید ثابت ہوں۔

اسلام نے علم اخلاق کو اس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ عرب کی جاہلی قوموں نے بھی اس کو مطابق فطرت پایا اور فلسفیوں کو بھی اس میں دلیل وبرہان کی جھلک نظر آئی دین اسلام کی تمام باتیں عین فطرت اور مطابق دلیل وبرہان ہیں۔ اس لئے کہ ان کا سرچشمہ وحی سماوی ہے جس میں غلطی کا امکان نہیں پایا جاتا۔

علم اخلاق انسان کے کسی خاص طبقہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ عام انسانی حق ہے اس کے نظام وقواعد اسی بنیاد پر بنائے گئے ہیں کہ اس سے تمام انسان برابر سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ جب تک انسانوں میں تربیت نفس کا ملکہ باقی رہے گا تب تک وہ فائدہ حاصل کرتے رہیں گے۔

یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ عام انسانوں کو علم اخلاق کی بے حد ضرورت ہے اس لئے کہ اخلاقی امراض لوگوں میں بہت ہیں اور مریض کو طبیب سے زیادہ دوا کی ضرورت ہوتی ہے۔

عوام غیر مانوس اصطلاحوں اور دور از فہم عبارتوں کو سمجھنے

کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لئے امامؑ پر لازم تھا کہ وہ ان کی فہم وفراست کے مطابق توضیح فرماتے۔ لہٰذا اور دوسرے افراد نے جو علم اخلاق کے مطالب پیش کئے ہیں۔ ان سب میں سب سے زیادہ واضح اور روشن انداز امام علیہ السلام کا ہے اس لئے کہ وحی الٰہی نے ائمہ کو ان تمام بحثوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

شیعہ علمائے حدیث کو ہمیشہ سے اپنے ائمہ کے چھوٹے بڑے اقوال وارشادات کو جو ''فقہ'' جعفری یا دوسرے موضوعات سے متعلق رہے ہیں، جمع کرنے کا بے حد شوق رہا ہے اس شوق کے نتیجے میں بڑی بڑی کتابیں وجود میں آئیں اخلاقیات امام جعفر صادق علیہ السلام ان میں سے اس کا ایک حصہ ہے۔

اس تدوین اخلاق کے سلسلے میں شیعوں کو امتیاز حاصل رہا ہے یہ امتیاز اس لئے نہیں تھا کہ ائمہ کے نصائح شیعوں کے لئے مخصوص تھے بلکہ یہ امتیاز انہیں اس لئے حاصل ہے کہ انھوں نے بڑے اہتمام سے ائمہ کے آثار کو جمع کیا ہے۔ اگر چہ امام کی نظر میں چند ہی شیعہ ایسے تھے جن کو نصیحت کرنا واجب تھا۔ لیکن ہمارے ائمہ کی خیر واصلاح سے محبت یہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو اگر ان کی نصیحت فائدہ پہونچا رہی ہے تو اسے روک دیا جائے۔ سفیان بن سعید ثوری اور اس کے ساتھیوں کو جو امامؑ نے اخلاق کی تعلیم دی ہے وہ ہمارے دعوے کی بہترین دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا:

''خَیرُ الناس مَنِ انتَفَعَ بِهِ النّاس''

(لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔)

اور آپ ہی نے پیغمبرؐ کی یہ حدیث پیش فرمائی:

''مَن لَم یُهتَم بِامورِ المسلمین فَلَیسَ مِنهم''

(جو مسلمانوں کے امور کا اہتمام نہ کرے وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔)

شیعوں کو اس وجہ سے امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنے ائمہ کی تعلیمات کو دسروں سے زیادہ سننے والے اور ان کے اقوال کو جمع کرنے والے ہیں اور امام علیہ السلام کی اخلاقی تربیت کے ضامن اور ان کے مذہب کے قائد ورہبر ہیں۔

اخلاقیات امام جعفر صادق علیہ السلام کے لعل وگہر حدیث واخلاق کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں فقط ڈھونڈ ھنے والی نگاہ چاہیئے۔ یوں تو کوئی مستقل کتاب اخلاق امام جعفر صادقؑ کے نام سے نہیں ہے۔ بشرطیکہ ''مصباح الشریعۃ'' کو مستثنیٰ کر دیا جائے اس لئے کہ علماء کا اس کے بارے میں اختلاف ہے پھر بھی ان بکھرے ہوئے موتیوں کو جو حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں یکجا کر دیا جائے تو یہ اخلاق کا ایک بہترین گلدستہ بن سکتا ہے۔

''مصباح الشریعۃ'' کے بارے میں ناقدین علم حدیث نے شک وشبہہ اور تردد کا اظہار فرمایا ہے ہم اس قول کے اثبات یا نفی کے سلسلے میں یہاں بحث نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ اس طرح کی بحثیں دوسری کتابوں کا حصہ ہیں۔ احادیث اخلاق وسنن توثیق کی محتاج نہیں

ہیں۔ ''مصباح الشریعۃ'' پر بہت سے علماء نے اعتماد بھی کیا ہے اور ایک جماعت نے اس کو معتبر جانا ہے اتنا ہی اس کی صحت کے لئے کافی ہے۔''

خلق

خلق کے لغوی معنی عادت، دین اور مروت کے ہیں۔ اہل لغت نے الگ الگ ہر معنی کے لئے اقوال عرب سے شواہد پیش کئے ہیں۔۔۔۔۔ یہ تمام الفاظ قریب المعنی ہیں۔ لیکن شاید لغت میں یہ لفظ ایک ہی معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے اور بقیہ معانی اسی کے متبادل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

علمائے اخلاق ''خلق'' کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ خلق نفس کا ایک ملکہ ہے جب انسان سے بغیر غور وکفر کے افعال صادر ہوتے ہیں تو یہ ملکہ ابھر کر سامنے آتا ہے اس ملکہ کی یہی خاصیت بھی ہے۔ یہ ملکہ اپنی اسی خاصیت کی بنا پر مشخص ہوتا ہے۔

بعض علمائے اخلاق کہتے ہیں کہ ''الخلق صورۃ الارادہ'' (الخلق الکامل، جز اول ص۔ ۵۱) خلق ''صورت'' ارادہ کا نام ہے شاید یہ علما اس تعریف کے ذریعہ مزید وضاحت کے ساتھ خلق کے مفہوم کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال حلق کی یہ دوسری تعریف ایک طویل شرح چاہتی ہے۔۔۔۔ لیکن اگر لفظ ''صورۃ'' سے مراد وہ ملکہ ہو جو نفس کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے اور عمل کے وقت ارادہ کا پابند ہوتا ہے تو پھر دونوں تعریفوں میں اختلاف نہیں رہ جائے گا۔

انسان کے نفس میں بہت سے صفات پائے جاتے ہیں جیسے وفا، صدق، سخاوت، شجاعت وغیرہ یہی صفات انسان کے بہت سے افعال واعمال کا مصدر ہیں۔ ان ہی نفسانی صفات کا نام اخلاق ہے۔

علماء اخلاق پہلی منزل میں نفس کی ان ہی صفات سے اس حیثیت سے بحث کرتے ہیں کہ یہ صفات معتدل اور غیر معتدل دونوں ہوسکتی ہیں نیز ان میں تبدیلی بھی پائی جاتی ہے لیکن وہ افعال جو انسان اپنے ارادہ اور اختیار سے انجام دیتا ہے جسے عقلاء خیر اور شر کہتے ہیں۔ اس کو علماء اخلاق ''سلوک'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دوسری منزل خیر وشر سے اس حیثیت سے بحث کرتے ہیں کہ یہ باطنی اخلاق کا ظاہری مظہر ہیں۔ اس لئے کہ عمل انسانی نفس کی صفت کو اگر وہ منحرف ہے تو مہذب بناتا ہے اور اگر مہذب ہے تو یہ عمل اسے منحرف بھی کرسکتا ہے۔

اس لئے ہم اختیاری عمل کو اس علم کا موضوع نہیں قرار دے سکتے۔ اس لئے کہ یہ رائے اصول علم سے متفق نہیں ہے۔ اگر چہ احمد امین صاحب نے اس رائے پر بہت اصرار کیا ہے اور اس کی بڑی طویل شرح بھی فرمائی ہے۔

اس علم کا موضوع ہی ''خلق'' ہے۔ خلق نفس کی صفت ہے نفس کے عمل کا نام خلق نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عمل اختیاری اس کے خارجی مظہر ہیں۔

اخلاق نہ تو کسی تصادم وتصادف کی پیداوار ہے اور نہ یہ کوئی اتفاقی نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ اخلاق ایک ملکہ ہے اور ملکہ کے لئے بنیاد کا ہونا ضروری ہے جس طرح کسی عمارت کے لئے بنیاد لازمی ہے۔ اخلاق کی بنیاد طبعیت وسرشت، وراثت، تربیت اور عادت ہے۔ قدیم فلسفیوں کا یہ قول کہ:

''جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کا نفس۔۔کورے کاغذ کی طرح صاف ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ اس کے منشاء کے مطابق تصویریں ابھرتی رہتی ہیں''۔۔۔۔اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے کا ذہن ایک آئینہ کی طرح ہوتا ہے جس میں بہت تیزی سے اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ جن چیزوں کو دیکھتا ہے ان سے متاثر ہونے لگتا ہے اور ہر نئی چیز اس کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔۔۔۔''کورے کاغذ'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ فطری اور موروثی طبیعتوں سے عاری ہوتا ہے، یہ ساری چیزیں تو اس کے اندر پائی ہی جاتی ہیں۔بس اخلاقی ملکہ سے اس کا نفس خالی ہوتا ہے۔ مربی اس کو صرف اخلاق سے آراستہ کرتا ہے۔اس کے اندر فطرت وسرشت کو ایجاد نہیں کرتا۔ اس مقام پر پہونچ کر وہ ان لوگوں کی رد بھی اپنے اسی قول سے کرتے ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ ''انسان فطرتاً فاعل خیر ہے'' اور جو یہ کہتے ہیں کہ ''انسان جبلّت کے اعتبار سے شریر ہے۔''

اس جگہ ہم جناب احمد امین کے ان اقوال کو ترک کرتے ہیں جو انھوں نے علمائے اخلاق کے اس قول کی تفسیر میں پیش کئے ہیں۔

لیکن وہ قانون وراثت جس کی طرف موصوف نے اشارہ فرمایا ہے اور جس کے ذریعہ انھوں نے مذکورہ بالا نظریہ کی تردید کی ہے۔ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ بچہ اپنے اسلاف کے اخلاق کا وارث ہوتا ہے، اس سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ بچہ کے اندر فطری اور موروثی طور پر ابتدائی اور بنیادی اخلاق ضد پایا جاتا ہے۔ فسلفہ قدیم بھی اس کا منکر نہیں ہے۔ قدیم شریعتیں اور قدیم عربی ادب بھی اس کا اعتراف کرتا ہے۔

اخلاق انسانی کی تشکیل میں اسی بنیاد کا اثر ایک نہج پر نہیں ہے اس لئے کہ طبائع، میلانات اور رغبتوں کے اعتبار سے مختلف شکل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔۔۔۔۔طبعیت موروثی ہوتی ہے۔۔۔۔۔تربیت ارادۂ عمل کے وقت نفس کو متوجہ کرتی ہے۔۔۔۔۔۔اور عادت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ رونما ہونے والی صفت، نفس میں جم کر اخلاق کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح مبادی اخلاق کی دو قسمیں ہوئیں ۔۔۔۔۔۔اختیاری اور۔۔۔۔۔۔۔اضطراری۔

۱۔ اختیاری مبادیات اخلاق انسان کے ارادہ واختیار کے محتاج ہوتے ہیں۔۔۔۔اختیاری کی صفت میں ''عادت'' اور ''تربیت'' کی بعض چیزیں آتی ہیں۔ جیسے مدرسہ، اسکول اور دوست واحباب۔

۲۔ اضطراری مبادیات اخلاق کے وجود میں ارادہ واختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس خود ان کا اثر انسان کے ارادہ پر ضرور پڑتا ہے۔ اس صف میں طبعیت ووراثت اور تربیت کی دوسری چیزیں شامل ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی اس کی تصریح کی ہے آپ فرماتے ہیں ''**ان الخلق منحة یمنحها الله فمنه سجیة ومنه نیة**'' اخلاق خدا کا عطیہ ہیں اس میں سے کچھ ''سجیة'' (طبعیت وعادت) ہیں اور کچھ کا نام ارادہ ہے۔ اس حدیث کے بقیہ حصے میں ''سجیة'' کا مطلب جبلّت بیان کیا گیا ہے۔ **صاحب السجیة ھو مجبول**

لايستطيع غيره وصاحب النية يصبر على الطاعة تصبر أفهو افضلها۔ (کافی۔حدیث ۴ باب الکلام)

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جبلت جس چیز کی طرف دعوت دیتی ہے اور فطرت جس چیز پر ابھارتی ہے وہ اخلاق حسن ہے۔ یہ چیز مشق سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔

اور کچھ چیزیں وہ ہوتی ہیں جو انسان کے میلان ورجان اور رغبت کے خلاف ہوتی ہیں ایسی چیزیں مجاہدۂ نفس اور مشق سے حاصل ہوتی ہیں یہ دوسری قسم زیادہ بہتر اور افضل ہے۔

جب ہم نے مذکورہ بالا اصول پر غور کیا تو پتا چلا کہ عادت اپنی خصوصیت میں منفرد ہے۔ عادت اخلاق کی تشکیل میں مستقل حیثیت رکھتی ہے یہ استقلال طباع وغیرہ کو حاصل نہیں ہے۔ اس لئے کہ اخلاق نام ہے ملکہ کا۔ اور نفس میں ملکہ بغیر تکرار عمل کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا انسانی طبیعت اور موروثی صفات اخلاق کی تعمیر میں عادت کی محتاج ہیں۔ عادت کو انسان کی ہر صفت کے بدل دینے میں قدرت حاصل ہے۔ اور عقل کو طبائع کی درستگی میں دخل حاصل ہے اس لئے کہ عقل کے اندر عادت کو سدھارنے اور سنوارنے کی قدرت موجود ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اس مفہوم کی مندرجہ ذیل الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں، آپ فرماتے ہیں:

''ماضعف بدن عمّا قويت عليه نيته''

اس کا بدن کمزور نہیں جس کی نیت یعنی عزم مستحکم ہے۔

طبائع نفسانی کو راہ راست پر لانا جہاد ہے۔ موروثی عادات سے چھٹکارا پانا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ یہ مشکل اس وقت آسان ہوجاتی ہے جب انسان کا ارادہ (نیت) قوی ہو لیکن اگر ارادہ کمزور ہے تو آدمی اپنے اندر خوبیاں نہیں پیدا کرسکتا۔

دوسرے مقام پر صادقؑ آل محمدؐ ارشاد فرماتے ہیں:

''ان الله ارتضىٰ ديناً فاحسنوا صحبة بالسخاو حسن الخلق'' (وسائل کتاب الجہاد)

اللہ نے تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا ہے۔ لہٰذا تم سخاوت اور حسن اخلاق کے ذریعہ اپنے اسلام کو اور جلا بخشو۔

یہ اللہ کا احسان وکرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے لئے دین اسلام کو منتخب فرمایا۔ یہ دین دنیا وآخرت دونوں ہی میں کامیابی کا ضامن ہے لہٰذا بندوں پر واجب ہے کہ وہ برے اخلاق کا مقابلہ کریں اس لئے کہ برے اخلاق پر باقی رہنا اسلامی تقدس کے خلاف ہے۔ حضرتؑ کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ تہذیب اخلاق اگرچہ جہاد (اکبر) ہے۔ لیکن حدود امکان سے باہر نہیں ہے۔

اسی طرح کی ایک دوسری حدیث بھی امام جعفر صادق علیہ السلام کی ملتی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ: ''من اساء خلقه عذب نفسه'' جس کا اخلاق بگڑ جائے اس کا نفس عذاب میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ بدخلقی ایک عذاب ہے جو انسان اپنے ہی ہاتھوں اپنے لئے مہیا کرتا ہے۔ یہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے جس سے ہر عاقل کا بچنا لازمی ہے۔۔۔۔ عذاب ان معنوں میں ہے کہ یہ نفس کی کمزوری

اور چراغ عقل کے گل ہوجانے کا سبب ہے۔ عذاب اس لئے ہے کہ یہ انسانیت کے لئے نقص ہے توازن اور اعتدال کو ختم کردیتا ہے۔ اس عذاب کو انسان اپنا لیتا ہے اور اسی میں مبتلا رہتا ہے۔ امام علیہ السلام مذکورہ حدیث کے ذریعہ انسان کے ارادہ کو ایک ایسا ہتھیار سپرد کردینا چاہتے ہیں جس سے کام لے کر صفات رذیلہ سے دور رہا جاسکے اور نقائص وعیوب سے مقابلہ کیا جاسکے۔

بعض علماء اخلاق تصور کرتے ہیں کہ اخلاق خود نفس کی پیداوار ہے جو تغیر وتبدل یا تہذیب واصلاح کو قبول نہیں کرتا۔ عقل کا اس پر کوئی زور نہیں ہے اور نہ ارادہ کے ذریعہ اس میں کوئی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ یہ ایک باطل نظریہ ہے جو سیاست کی بنیادوں کو ڈھادیتا ہے اور شریعت کے فائدہ کو لغو اور نظم اخلاق کو باطل کردیتا ہے۔ اور یہی باتیں اس نظریہ کے باطل ہونے کے لئے کافی ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے قول ''صاحب السجیة هو مجبولٌ لایستطیع غیره۔ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اخلاق کو سدھارا نہیں جاسکتا بلکہ اس کا مفہوم فقط یہ ہے کہ اخلاق کی تشکیل عادتوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ انسان کے لئے زیادہ دشواری اس وقت ہوتی ہے جب (برے) اخلاق کو جنم دینے میں طبعیت اور عادت دونوں مدد کریں۔ جب طبعی میلانات کا ساتھ ارادہ بھی دینے لگتا ہے تو عمل میں تیزی پیدا ہوجاتی ہے اور عمل کی تکرار عادت کا روپ اختیار کرلیتی ہے پھر اسی سے (برے) اخلاق کی بنیاد پڑتی ہے پھر بھی اگر اس کا دفاع کیا جائے اور عادت سدھارنے کی کوشش کی جائے تو اس میں درست ہونے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ عادت کو بدلنا آسان ہے مگر بگڑی ہوئی طبعیت میں اعتدال پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔

اسی کو اہل بیت علیہم السلام نے جہاد کے نام سے تعبیر کیا ہے اور سے جہاد کہنا بحق بجانب بھی ہے۔ اخلاق کو درست کرلینا مجاہد کی ہوشیاری کی دلیل ہے اس میدان میں غالب آنے والے کے لئے وہی اجر ہے جو ایک مجاہد کا اجر ہوتا ہے۔ پیغمبرؐ نے کسی جہاد کی واپسی پر فرمایا تھا:

مرحباً بقوم قضو الجهاد الاصغر وبقی علیهم الجهاد الاکبر۔

مرحبا ہو اس قوم پر جو جہاد اصغر سے پلٹ کر آرہی ہے لیکن ابھی جہاد اکبر باقی ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ:

جہاد اکبر جہاد نفس کو کہتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ:

واجعل نفسک عدوّ أتجاهده۔

تم اپنے نفس کو اس دشمن کی طرح سمجھو جس سے تم جہاد کررہے ہو۔

نفس سے مراد یہاں ملکات وضیعہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس دھوکہ باز دشمن سے بڑا دشمن کون ہوگا جس سے جنگ کی جائے۔ یہ وہ دشمن ہے جو نصیحت کی آستین میں بے وفائی کا خنجر چھپائے ہوتا ہے۔ جو تمناؤں کی مٹھاس میں قاتل زہر گھول دیتا ہے یہ وہ داخلی دشمن ہے جس سے دفاع ہر حال میں واجب ہے۔

امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام

ظلم وجور سے جنگ کے علم بردار

عماد العلماء علامہ سید علی محمد نقوی مدظلہ

آسمان ولایت کے ساتویں خورشید حضرت امام موسی کاظم علیہ السلام اکثر مورخوں کے قول کے مطابق ۱۷ رصفر ۱۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ امام کاظم علیہ السلام امام صادق علیہ السلام کے تیسرے فرزند تھے۔آپ کی والدہ مکرمہ بربرقوم کی ایک پرہیزگار خاتون تھیں۔

ساتویں امام کا دورِخلافت منصور کا آخری دور تھا آپ کا دور منصور کے بعد مہدی اور ہادی کے دور سے ہوتا ہوا خلافتِ ہارون کے تیرہ سال تک رہا۔

عباسیوں کو اگرچہ (ابوعباس) سفاح نے اقتدار تک پہنچایا مگر خلافتِ عباسیہ کا اصلی بانی منصور تھا۔اس نے چالاکی، سیاست بازی اور خوں آشامی کے ذریعہ عباسی اقتدار کو مستحکم کیا۔منصور کے دورِ اقتدار میں زیادہ تر سادات اور علوی جو حکومتِ حق کے قیام کے لئے کھڑے ہوئے تھے یا جو ائمہ اہل بیتؑ کی پشت پناہی کررہے تھے شہید کردیئے گئے البتہ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں خود منصور شہر بغداد کو جدید پایۂ تخت بنانے میں سرگرمِ عمل تھا

اسی وجہ سے امام موسی کاظم علیہ السلام کو علمی وتہذیبی سرگرمیوں کا موقع مل گیا جس کی ابتداء امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کر گئے تھے۔اس دور میں شیعوں کی علمی فکری اور تہذیبی رہنمائی کا کام امام موسی کاظم علیہ السلام کے ذمہ تھا کیوں کہ ہر سیاسی اور انقلابی تحریک کے لئے پہلے نظریاتی اور فکری تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ دور شیعوں کے تشتت وعقیدہ کا بھی دور تھا۔فرقۂ کیسانیہ اور زیدیہ کے علاوہ اب فرقہ اسماعیلیہ اور عبداللہ افتح کے پیروؤں کا مزید اضافہ ہوگیا تھا اس وجہ سے بہت زیادہ ضروری ہوگیا تھا کہ شیعوں کے بنیادی عقائد اور نظریات کی بہت زیادہ واضح تفسیریں اور توجیہیں پیش کی جائیں اس طرح امام موسی کاظم علیہ السلام کے ابتدائی دس برسوں کو نظریات کی وضاحت کا دور سمجھنا چاہئے جس کی ابتدا امام محمد باقر علیہ السلام کے دور سے ہوئی اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور میں بھی جاری رہی۔

ائمہ کے مقابلے میں حکومت کے رویہ کے لحاظ سے اور

امام کے کارناموں کے پیش نظر امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کے دور کو انتقالی دور شمار کیا جاتا ہے۔ نسبتاً آزادی کا دور جو شیعوں کو محض امویوں اور عباسیوں کی باہمی کشمکش کی وجہ سے مل گیا تھا اور یہ دور امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانہ سے ہوتا ہوا امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے زمانے کے دس سال تک قائم رہا۔ اس دوران میں ائمہ نے شیعہ تہذیب کی ترویج کا کام کیا۔ اس کے بعد ظلم و استبداد، سرکوبی اور حبس کا دور شروع ہوا جس سے امام کاظم علیہ السلام، امام جواد علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام دوچار رہے (امام رضا علیہ السلام کا دور ایک خاص خصوصیت کا حامل ہے اور ایک مستثنیٰ دور سمجھا جاتا ہے۔

ادائیگی کردار کے لحاظ سے بھی امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کا دور فعالیت، علمی تدوین ''نظام'' نشر و اشاعت اور آگاہی سے سیاسی جنگ کی طرف انتقال کا دور ہے۔ تدوین ''نظام'' کے مرحلے کے بعد پھر ''اقدام'' کا مرحلہ آجاتا ہے اور شواہد بتاتے ہیں کہ امام کاظم علیہ السلام اس کے لئے زمین ہموار کر رہے تھے۔

منصور کے بعد یکے بعد دیگرے مہدی، ہادی اور ہارون برسر اقتدار آئے۔ یہ زمانہ حقیقتاً خلافت عباسیہ کے اقتدار اور شیعوں اور علویوں کی سرکوبی اور ان پر ظلم و تشدد کے عروج کا تھا۔ اس دور میں بہت سی شیعی تحریکیں شروع ہوئیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فکری اور علمی فعالیت کے اتمام کے بعد سیاسی اقدامات کی تیاری فرما رہے تھے۔

امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کی زندگی اور مفہوم منزلت و امامت

شیعہ نقطۂ نظر سے امام ایک ایسی فرد ہے جس کو بحیثیت ''خلیفہ الٰہی'' تمام روحانی، اخلاقی، علمی توفیق عطا کی جاتی ہے وہ خلق کے لئے ایک نمونہ اور فیض خداوندی کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ امام صفات عالیہ اور مقامات معنوی میں بہترین خلائق اور قلم روسیاسی، اجتماعی اور فکری کے رہبر اور پیش روا، روح اسلام کے حامل، منابع ماورائی سے رابطہ رکھنے والے اور نظام الٰہی اسلام کے اجرا کنندہ ہوتے ہیں۔ امام مندرجہ ذیل ذمہ داریوں کے عہدہ دار ہوتے ہیں۔

۱۔ سیاسی اور غیر سیاسی رہبری

۲۔ گفتار و رفتار سے معارف اسلامی کی تشریح استحکام بیان اور دین کی حفاظت۔

۳۔ روحانی کردار، امامتِ باطنی اور معاشرے کی روحانی اور اخلاقی رہنمائی۔

امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام شیعوں کے ساتویں پیشوا بھی مندرجہ بالا اصولوں اور خصائص کا مجسمہ تھے۔ مندرجہ ذیل سطور میں ہم ساتویں امام کی عملی زندگی نیز مفہوم امامت اور ان کی ذمہ داریوں کا مختصر جائزہ لیں گے۔

امام کا علم وہبی

امام کی منجملہ خصوصیات میں ایک خصوصیت علم وہبی بھی ہے یعنی پیدائش کے وقت سے ہی امام خصوصی قوت ملکہ اور علم حضوری کا مالک ہوتا ہے اور مدرسہ مکتب اور اکتساب کا محتاج نہیں ہوتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک معصوم دوسرے معصوم سے اور اپنے پیشرو سے رموزِ علم وحکمت الٰہی اور باطنی بلندیاں حاصل نہیں کرپاتا جیسا کہ ائمہ نے مکرر اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے مگر انھیں حالات میں امام منبع فیضان الٰہی سے براہِ راست بھی سیراب ہوتا ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بھی اس مفہوم کا عملی پیکر تھے اور تاریخ وسیر کی کتابیں بھی اس امر کی گواہی دیتی ہیں۔ امام کاظم علیہ السلام جب کم عمر تھے اس وقت اہل سنت کے حنفی مسلک کے پیشوا ابوحنیفہ سے ان کی گفتگو اور مناظرہ اس حقیقت کا ایک منھ بولتا گواہ ہے۔ سیرت نویسوں میں سے اکثر نے اس مناظرہ کو ابوحنفیہ کے قول سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''سفرحج کے موقع پر بعض اختلافی مسائل پر امام صادق علیہ السلام سے گفتگو کی غرض سے اوران سے ملنے کے لئے مدینہ پہونچا۔ ملاقات کی اجازت کے انتظار میں دہلیز پر بیٹھا تھا کہ اچانک ایک بچہ باہر آیا جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا اگر کوئی مسافر رفع حاجت کی ضرورت محسوس کرتا ہو تو کیا کرے بچہ نے ایسا مفصل اور مدلل جواب دیا اور اس سلسلے میں واجبات، مستحبات اور مکروہات گنوائے کہ میں شرمندہ ہو گیا۔

اس کے بعد حنفی مسلک کے امام ابوحنیفہ نے ایک پیچیدہ سوال کیا ''گناہ کا سرچشمہ کیا ہے؟'' موسیٰ بن جعفر علیہ السلام نے جواب دیا ''گناہ کا سرچشمہ یا خالق کی ذات ہوسکتی ہے یا مخلوق کا عمل یا خالق ومخلوق دونوں کا اشتراک، اگر گناہ کا سرچشمہ خالق ہوتا تو اس کے لئے وہ بندوں کو سزا نہ دیتا۔ اگر گناہ کا سرچشمہ خالق ومخلوق کا مشترکہ ارادہ ہوتا تو بھی خالق کی ذمہ داری زیادہ تھی کیوں کہ وہ زیادہ طاقتور ارادے کا مالک ہے۔ لہٰذا قوی تر ہو کر وہ ضعیف تر کو سزا نہ دیتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اب اگر گناہ کا سرچشمہ خود مخلوق کا عمل ہو جیسا کہ ہے تو ایسی صورت میں اگر خداوند تعالیٰ اسے بخش دے تو اس کا کرم ہے اور اگر سزا دے تو اس کا انصاف ہے۔''

ظلم وستم کے خلاف جنگ میں امام کا کردار

امام کے اہم کرداروں میں ایک کردار معاشرے کی سیاسی اور اجتماعی رہبری ہے۔ ساتویں امام موسیٰ کاظم بن جعفر علیہ السلام کا دورِ خلافت منصور کے آخری برسوں، خلافت ہادی کے مکمل دور اور خلافت ہارون کے ۱۳؍سال تک رہا۔

درحقیقت یہ دور خلافت عباسیہ کے عروج اور شیعوں اور علویوں کے لئے سرکوبی، حبس اور ظلم وتشدد کا دور تھا۔ منصور کے دورِ اقتدار میں بیشتر سادات اور علوی جو حکومت

حق کے قیام کے لئے کھڑے ہوئے تھے یا جو پشت پناہ عترت تھے بے رحمی کے ساتھ شہید کر دیئے گئے تھے۔ امامؑ نے اس زمانے میں حکومت کے خلاف جدوجہد کی در پردہ رہنمائی کی ہے اور سادات اور علوی جو تحریک کے لئے کھڑے ہوئے تھے شاید ان میں امام کے وجود نے جوش وولولہ پیدا کر دیا تھا۔ امام نے شہید سادات کے پسماندگان کی دیکھ بھال اور مومنین کی رہنمائی کی۔ بنی عباس اس وجہ سے بہت زیادہ خوف زدہ تھے ابن خلکان نے ''وفیات الاعیان'' میں لکھا ہے کہ خلیفہ عباسی مہدی نے امام موسیٰؑ کاظم علیہ السلام سے کہا ''کیا مجھ کو تمہاری بغاوت سے امان مل سکتی ہے؟''

اور منتہی الامان (باب نہم، فصل پنجم میں آیا ہے کہ ہارون نے امام موسیٰ بن جعفر کے متعلق کہا کہ ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایسا فتنہ نہ برپا ہو جائے کہ خون کی ندیاں بہہ جائیں۔'' یہ تمام شواہد بتاتے ہیں کہ امام چپ چاپ امت کی رہبری کا کام انجام دیتے رہے اور حکومت اور ظلم وتشدد کے خلاف جنگ کے وسائل بھی بہم پہنچاتے رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہارون امام کو مدینہ سے بغداد کیوں لاتا اور سالہا سال قید تنہائی میں ان پر نظر کیوں رکھتا۔ حالاں کہ ہارون امام کی منزلت سے واقف تھا مگر ان کی طرف سے اپنے اقتدار کے لئے سخت خطرہ محسوس کررہا تھا۔ کتاب ''مختصر اخبار الدول'' میں امامؑ کے حالات کی شرح کے ضمن میں منقول ہے کہ مدینہ میں جب امامؑ ہارون کے سامنے تشریف لائے تو ہارون نے غیر معمولی طور پر ان کا احترام کیا جب آپؑ تشریف لے گئے تو مامون نے باپ سے پوچھا کہ ''یہ آدمی کون تھا؟'' ہارون نے جواب دیا ''یہ تمہارے چچا ہیں جنھیں تم نے آج دیکھا، یہ ہر شخص کے مقابلے میں امامت اور پیشوائی کے زیادہ مستحق ہیں لیکن اگر میں دیکھوں گا کہ میرے خلاف کوئی تحریک اٹھا رہے ہیں تو میں انھیں ختم کردوں گا'' اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہارون اپنی تمام تر قوت وطاقت کے باوجود امام کی جانب سے ہمیشہ خائف اور ہراساں رہتا تھا۔ شیعوں کے ائمہ ظلم وستم، انحراف ودیدہ دلیری اور نفاق وکفر کی قوتوں کے خلاف جنگ کرنے میں سب سے آگے تھے۔ امام کاظم علیہ السلام نے صفوان بن یحییٰ سے فرمایا کہ ''جو شخص بھی کسی طرح یہ چاہتا ہو کہ ظالم باقی رہیں تو وہ بھی ظالم ہے۔''

دو وجہوں سے سربراہان خلافت شیعوں کے ائمہ سے بے حد خوف زدہ رہا کرتے تھے: پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ اپنے مقام علمی اور فضیلت کی وجہ سے عوام کے محبوب تھے۔ ایسی حالت میں جب نیزہ وشمشیر اور زر وزور سب خلفاء کے ہاتھوں میں تھا ائمہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے اور دوسری وجہ اسلامی جہاد اور ائمہ کی سیاسی رہبری تھی۔

مندرجہ بالا بیان کے مطابق ہارون کے تاثرات ہمارے بیان کردہ دونوں نکتوں کے مظہر ہیں۔ ایک طرف تو

ہارون امام کے فضائل مدارج علمی اور معنوی کمالات سے واقف تھا اسی وجہ سے وہ امام کا دشمن بھی تھا اور ان سے خوف زدہ بھی۔ دوسری طرف امام ہفتم کی جنگی اور انقلابی رہبری کی وجہ سے بہت خوف زدہ تھا۔

امام کاظم علیہ السلام فکری تحریک کے علم بردار

معارف اسلام کی تشریح اور مکتب ونظریات کی حفاظت امام کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے چنانچہ امام صادق علیہ السلام کے بعد امام موسی بن جعفر نے معارف اہل بیتؑ کی تدوین اور نشر واشاعت کی عظیم تحریک کو پورا کرنے کی ذمہ داری ادا کی۔

جس دور میں امام کاظم علیہ السلام نے امت کی رہبری کی ذمہ داری سنبھالی وہ دنیائے اسلام میں اجنبی افکار اور نظریات کے ہجوم اور مختلف فلسفی اور کلامی مکاتب فکر کے قیام کا دور تھا۔ ایک جانب ہندی، مسیحی اور یونانی افکار رخنہ اندازی کر رہے تھے تو دوسری جانب زندیق، صوفی اور دہریہ جیسے مہلک نظریات عروج پر تھے۔ امامؑ نے اسلامی عقاید کی حقیقت کی تشریح اور اس کے معارف کے ذریعہ دین کے محاذ کی حفاظت کی۔ شیعہ فقہ حدیث اور کلام کی کتابیں جو امام موسی بن جعفر کے بیان پر مبنی ہیں، ائمہ کی چھوڑی ہوئی مستغنی کرنے والی میراث ہے۔ ہشام بن حکم، یونس بن عبدالرحمن، صفوان بن یحییٰ، محمد بن ابی عمر، عبداللہ بن المغیر ہ، حسن بن محبوب السراد، احمد بن ابی نصر بزنطی، معمر بن خلاف، عبدالرمان بجلی، علی بن جعفر اسحق بن عماد صیرفی، اسماعیل موسی بن جعفر، حسین بن علی بن حصال داؤد رقی، عبدالسلام بن صالح حصروی، موسی بن بکیر اور صدہا علم الکلام، حدیث وفقہ کے علمائے بزرگ جنھوں نے زبردست انقلاب برپا کیا۔ امام موسی بن جعفر کے اصحاب تھے اور ان کے علم الٰہی سے فیضیاب ہوئے تھے۔

صدرالمغالہیں ملا صدر احادیث عقل کی شرح میں جو امام موسی کاظم علیہ السلام نے ہشام ابن حکم سے بیان کی تھی لکھتے ہیں کہ ''یہ حدیث ایسی خصوصیات عقل کی حامل ہے کہ دوسرے صاحبانِ نظر و دانش منداور عرفا کی کتابوں کی کئی جلدیں بھی اس کے مماثل نہیں ہوسکتیں۔ اس حدیث کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اس میں علم ماوراء طبیعات، فلکیات، نفسیات، علم اخلاق، سیاست مدنی کے متعلق اشارات اور مواعظ، پند ونصائح اور پیدائش آخرت کی توجیہہ کا ایک عظیم خزانہ موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد موسیٰ دانش مندی مصری اہل سنت کتاب ''الفقہ الاسلام'' میں لکھتے ہیں۔ پہلی فرد جس نے فقہ پر تدوین شدہ کتاب چھوڑی امام موسی بن جعفر علیہ السلام تھے جنھوں نے ۱۸۳ھ میں زندان میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ تمام باتیں ان حقائق کا مظہر ہیں کہ کس طرح ایک امام ظلم وستم اور سختیوں کے پرآشوب دور میں بھی مکمل دین اسلام کا تحفظ، اس کی شرح اور اس کے افکار وعقائد کی نگرانی کرتا ہے۔

حضرت امام حسن عسکریؑ اور مصائب

محترمہ بنت زہرا نقوی صاحبہ معلمۂ جامعۃ الزہراء

''یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِؤُا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۔

ہر زمانے میں نور الٰہی کے مٹانے کی کوشش کی گئی لیکن پروردگار عالم نے اپنے نور کو باقی رکھا تاکہ لوگ اس کے وجود سے فیضیاب ہوتے رہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ظالم کا ظلم و ستم روز بروز بڑھتا رہا۔ ائمہ معصومینؑ کی زندگیاں بھی ہمیشہ حکام وقت کی طرف سے مصائب و مظالم کا نشانہ بنی رہی۔ اور شاید ہی کوئی ایسا حاکم رہا ہو جس نے اپنی حکومت کا مقصد آل محمدؐ پر ظلم و ستم کو نہ قرار دیا ہو۔

لیکن امام حسن عسکریؑ کی زندگی ایک عجیب و غریب مصیبت کا نشانہ رہی ہے جس کی مثال دیگر معصومینؑ کی زندگیوں میں بھی نہیں ملتی ہے۔ اور اس کا اہم ترین راز یہ ہے کہ عالم اسلام نے دور پیغمبرؐ سے یہ بات سن رکھی تھی کہ میرا بارھواں وارث وہ حجت پروردگار ہوگا جو ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے معمور کر دے گا اور دنیا کے ہر نظام ظلم کا تختہ اُلٹ دے گا۔ اس بنا پر حکام وقت ہر دور میں اس نکتہ کی طرف متوجہ رہے کہ وہ مہدیؑ دوراں منظر عام پر نہ آنے پائے۔ امام حسن عسکریؑ کے دور تک یہ اطمینان تھا کہ مہدی اولاد حسینؑ کا نواں ہوگا۔ اور ابھی اولاد حسینؑ کے آٹھ افراد پورے نہیں ہوئے ہیں لیکن امام عسکریؑ کا دور آنے تک ہر صاحب علم و خبر کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اب وجود مہدی کا دور قریب آ گیا ہے اور وہ انھیں کی اولاد میں ہوگا۔ چنانچہ آپ کی خصوصی نگرانی شروع ہو گئی اور آپ کے گھر والوں کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ حُکام زمانہ کا برتاؤ ائمہ معصومینؑ کے سلسلہ میں نہایت سخت تھا۔ مولائے کائنات کی شہادت سے لے کر کربلا کے سانحے تک آل محمدؐ پر نازل ہونے والی کون سی مصیبت ہے جس میں بنی امیہ کا ہاتھ نہ رہا ہو۔ اور جس خون سے کسی نہ کسی اموی حاکم کے ہاتھ رنگین نہ ہوں۔ لیکن ان تمام مظالم کے ہوتے ہوئے بنی عباس کے مظالم کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

''خدا کی قسم! بنی امیہ کے مظالم بنی عباس کے مظالم کے مقابلہ میں عُشر عشیر بھی نہیں ہیں۔'' کہ جس عباسی حاکم نے تخت حکومت پر قدم رکھا اس کا پہلا کام یہ تھا کہ اولادِ رسولؐ کو ستایا جائے اور ان کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے۔ کہ جس کا اندازہ بھی انھیں حالات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہارون کا امام موسیٰ کاظمؑ کو مسلسل قید خانہ میں رکھنا اور قید و بند کے عالم میں شہید کرا دینا، مامون کا امام رضاؑ کو ولی عہد بنانا پھر شہید کرا دینا۔ امام محمد تقیؑ کو داماد بنانا اور پھر نشانہ ستم بنا کر معتصم کا آپ کو زہر دلا دینا، متوکل کا قبر امام حسینؑ کی بربادی کا سامان کرنا اور اس طرح کے بے شمار مظالم ہیں جو ائمہ

معصومینؑ کے سامنے آتے رہے ہیں اور بنی عباس کے نمک حرام حکام جس کے نام پر برسراقتدار آئے تھے اسی کے گھرانے کو بے نام ونشان بنانے پر تلے رہے ہیں۔

امام حسن عسکریؑ کو ان مصائب میں سے ایک نیا حصہ ملا تھا کہ ظالمین کو معلوم تھا کہ پیغمبر اسلام کا بارہواں وارث ظلم کی بساط کو الٹ دے گا اور اس کے آنے کے بعد ظلم وجور کا خاتمہ ہوجائے گا اور یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی نسل کے گیارہویں وارث ہیں لہٰذا مظالم کا تمام تر رُخ آپ کی ذات مبارک کی طرف تھا اور ہر ایک آپ کی زندگی کے خاتمے کا درپے تھا۔

چنانچہ ظالموں نے قتل کرنے کے بجائے اذیتوں کا راستہ اختیار کیا مگر نگاہِ قدرت میں اولیاء خدا کے صبر کے جوہر کھلنے کا یہ بہترین راستہ ہے۔ مظالم اپنی حد سے گذر گئے۔ قید وبند، خانہ نشینی، نظر بندی اور اس طرح کے شدید ترین حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ جس قصر میں ظالم آرام کرے اس کے گوشے میں امام کو قیدی بنا کر رکھا گیا کہ یہ آل رسولؐ کے ساتھ امت کی نگاہ میں بہترین برتاؤ تھا۔

آپ کے قید خانہ کا ایک واقعہ ملتا ہے کہ جب آپ (امام حسن عسکریؑ) قید کر لیے گئے تو خاندان بنی عباس اور اس کے اطراف کے منحرفین میں سے صالح بن علی وغیرہ صالح بن وصیف کے پاس پہنچے اور اس سے کہا کہ: حضرت ابومحمد علیہ السلام کے ساتھ ذرا بھی نرمی نہ کرنا، بلکہ اور سختی میں اضافہ کردو۔

صالح بن وصیف نے کہا، حتی الامکان میں نے دو شریر وظالم ترین لوگ ان پر مامور کئے مگر وہ دونوں ہی آپ کی نماز اور عبادت کو دیکھ کر متأثر ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد اُس نے ان دونوں محافظوں کو بلوایا۔ ان سے پوچھا، بتاؤ تم دونوں کی اس مرد (امام حسن عسکریؑ) کے متعلق کیا رائے ہے؟

انھوں نے کہا، ہم ایسے شخص کے متعلق کیا کہیں جو دن بھر روزہ سے رہتے ہیں اور رات بھر عبادت کے سوا نہ کسی سے کوئی بات کرتے ہیں، نہ کسی اور کام میں مشغول ہوتے ہیں۔ وہ اگر کبھی نظر اٹھا کر ہم لوگوں کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمارا بند بند کانپنے لگتا ہے اور دل اس طرح لرزنے لگتا ہے کہ اپنے قابو سے باہر ہوجاتا ہے۔

عباسیوں نے جب یہ سنا تو وہاں سے مایوس واپس ہو گئے۔

خلیفہ کی پریشانی بڑھ گئی اور وہ آپ کو مٹانے کی فکر میں لگ گیا۔ یہاں تک کہ معتمد نے آپ کو زہر دلوادیا۔ اور اس طرح ۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ میں امامت کا گیارہوں قمر گہن میں آگیا اور ہمیشہ کے لئے اپنے فرزند ارجمند قائم آل محمدؑ سے رخصت ہو گئے۔

روایت کے مطابق آپ کی نماز جنازہ آپ کے بھائی جعفر بن امام علی النقیؑ نے جب پڑھانے کے لئے تکبیر کا ارادہ کیا ویسے ہی ایک کمسن صاحب زادے برآمد ہوئے اور فرمایا: چچاجان: میں اپنے پدر بزرگوار کی نماز جنازہ پڑھانے کا زیادہ حقدار ہوں۔ یہاں تک کہ آپ نے آگے کھڑے ہوکر نماز جنازہ پڑھائی اور آپ کے پدر بزرگوار کے پہلو میں آپ کو دفن کر دیا گیا۔

آخر کلام میں ہم منتقم خون شہداء کربلا حضرت امام عصرؑ کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہیں۔

''وسیعلم الذینَ ظَلَمُوْا اَیَّ منقلبٍ ینقلبون''

خطباء، ذاکرین، ادیبوں اور شعراء کرام سے!

احسن العلماء مولانا حسن ظفر نقوی اجتہادی صاحب (کراچی)

جس طرح ہر لشکر ڈویژنوں، پلٹنوں اور دستوں میں تقسیم ہوتا ہے اور ہر دستہ، پلٹن اور ڈویژن کے درجہ بہ درجہ سالار ہوتے ہیں۔ آپ خطباء کرام، ذاکرین عظام، ادبیان محترم اور شعراء والا مقام حسینی لشکر کے دستوں کے سالاروں کی حیثیت کے حامل ہیں۔

یہی مقام ہمارے محترم نوحہ خواں حضرات اور مرثیہ خواں حضرات کو حاصل ہے۔ آپ کچھ دیر کے لیے یہ تصور کر لیجئے کہ آپ کو ایک دستہ کا سردار مقرر کر دیا گیا ہے تو آپ اپنے دستہ کی سالاری کیسے کریں گے؟ آپ سب خدمت گذاران مکتب اہل بیتؑ ہیں۔ آپ پر اس لشکر کو منظم کرنے کی سنگین ذمہ داری ہے، آپ سب اپنے اپنے میدان کے سالار ہیں۔ آپ کی قوت بیان، آپ کی تحریر، آپ کا کلام، آپ کا انداز بیان، آپ کی خوبصورت آواز یہ سب آپ کے پاس زہراؑ کی امانت ہیں۔

بارگاہ حسینیؑ سے آپ کو اور ہم کو جو عزت و وقار عطا ہوا ہے وہ دنیا کی کسی بارگاہ یا دربار سے نہیں مل سکتا، پھر ہم اس عظیم نعمت الٰہی کا شکر کیسے ادا کریں؟ شکران نعت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس نعمت کو انہی کی خدمت میں صرف کیا جائے جن کی یہ عطا ہے۔ اپنی جوان نسل کی تربیت کی ذمہ داری کسی ایک فرد یا ایک عالم کی نہیں ہے بلکہ یہ تو ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے، ان کی ذمہ داری ہے جو شعور و آگاہی کی دولت سے مالا ل ہیں، جو سینے میں درد ملت رکھتے ہیں۔

آپ کے پاس منبر ہے، آپ کے پاس قلم ہے، آپ کے پاس فکر ہے، زور بیان ہے، آواز ہے۔ یہ سب وقف کر دیجئے ملت کے حالات بدلنے کے لئے۔ ایک شہرت وقتی اور زمانی ہے اور ایک ابدی اور لافانی ہے، ایک عزت صرف دنیا تک محدود ہے اور ایک عزت دنیا و آخرت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایک بار ہم صرف لوگوں کے سامنے سرخرو ہو کر خوش ہوجاتے ہیں اور ایک بار خدا و رسولؐ اور ائمہ معصومینؑ کے سامنے سرخروئی کی بات ہے۔

یہ فیصلہ کی گھڑی ہے کہ ہمیں کون سی شہرت، عزت اور سربلندی درکار ہے۔ درست ہے کہ راہ حق بہت مشکل اور دشوار گذار ہے، سخت ہے، امتحان بار ہے۔ مگر کیا ہمارے پاس اسوۂ حیدر کرارؑ اور کربلا والوں کا کردار نہیں ہے اگر واقعی ہم کربلا والے ہیں اور راسخ العقیدہ حسینی ہیں تو ہمیں اسی سخت اور دشوار گذار راستے کا انتخاب کرنا ہوگا جو ابوذر غفاریؓ، میثم تمارؓ اور قنبرؓ جیسے علیؑ کے غلاموں نے کیا تھا۔ اس راہ پر چلنا پڑے گا جس راہ پر چل کر حبیب ابن مظاہرؓ ساری رکاوٹیں عبور کر کے اپنے مولا کے قدموں میں پہنچ گئے تھے، اس طرح اپنے آپ کو ظلمات سے نکالنا پڑے گا جس طرح حر

ظلمات سے نکل کر نور کی طرف گیا تھا۔

آج انتہائی معذرت اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ بعض جگہ ہمارے منبر کا معیار انتہائی گر چکا ہے، آداب منبر کا کوئی پاس نہیں رہا ہے، علمی سطح اس حد تک گر چکی ہے کہ بعض اہل منبر تشیع کے بنیادی عقائد سے بھی کما حقہ آگاہ ہی نہیں رکھتے۔ سارا زور صرف انداز بیاں اور چند رٹے ہوئے واقعات کو بار بار گھما پھرا کر پیش کرنے پر ہوتا ہے۔ یہ Formal مجالس ہم میں انقلابی روح بیدار نہیں کر سکتیں۔ کردار سازی منبر کا حق ہے، حسینؑ نے ہمیں تاریخ میں زندہ کر رکھا ہے تو ہمارا بھی فرض ہے کہ اسوۂ حسینؑ، مقصد حسینؑ اور منشور حسینؑ کو زندہ رکھیں۔

ایک مسجد میں نماز کی امامت کرنے کے لیے پیش امام کے لیے کتنی شرائط رکھی گئی ہیں مگر منبر پر بیٹھ کر ہزاروں انسانوں کے ذہنوں پر حکومت کرنے والے کے لیے ہم کسی شرط کے قائل اور پابند نہیں ہیں۔ ایسا قطعاً نہیں ہونا چاہئے اور اس سلسلے میں بانیان عزا پر بھی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ فرش عزا بچھانا محض رسمی کارروائی نہیں ہے اور نہ ہی محض مجمع اکٹھا کرنا مقصود ہوتا ہے بلکہ فرش عزا بچھانے کا مقصد ایک طرف غم منانا اور دوسری طرف پیغام حسینیؑ کو دنیا تک پہنچانا ہے۔

اب آج کے دور میں ہم یہ پیغام کس طرح پہنچائیں؟ یقینا جب تک ہمارے اہل منبر اپنے بیان کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کریں گے، بدلتی ہوئی اقدار کا لحاظ نہیں کریں گے، سماجی رشتوں کا پاس نہیں رکھیں گے کس طرح یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ لوگ ہماری مجلسوں کا رخ کریں۔ ہمارا انداز تو ایسا ہونا چاہیے کہ لوگ خود بہ خود کھنچ کر مکتب اہل بیتؑ کی طرف آ جائیں نہ کہ ان کے دلوں میں نفرتیں بوئی جائیں۔ یہ درست ہے کہ ساری دنیا نے نہ تو کبھی حق تسلیم کیا ہے اور نہ سب نے ساتھ دیا ہے لیکن ہمیں تو اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے پوری کرنا ہوگی۔

اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟ ابھی نصف صدی پہلے تک لکھنؤ میں ایسی اکیڈمی موجود تھی (اور میری اطلاعات کے مطابق برسوں کی زبوں حالی کے بعد ایک بار پھر اس اکیڈمی کو نئی زندگی ملی ہے) جہاں ایسے واعظ اور خطیب تیار کئے جاتے تھے جو منبر پر جا کر پوری ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مدرسۃ الواعظین، ناظمیہ اور سلطان المدارس لکھنؤ ماضی میں یہ خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

یہاں بھی ہمیں واعظین اور خطباء کے لیے ایک ایسی اکیڈمی قائم کرنا پڑے گی جو چند سال تک باصلاحیت افراد کی تربیت کے فریضے کو انجام دے اور انہیں باقاعدہ سند دے کر فارغ کیا جائے تاکہ وہ معاشرے کی ضروریات کو پورا کر سکیں اور یہ جو آج کل (Short-cut) مختصر راستہ نکلا ہوا ہے کسی بھی مشہور ذاکر کی چند کیسٹوں کا رٹا لگا کر یا چند معروف خطباء کی مجالس یاد کر کے علامہ کا لیبل لگوا لیا۔ نہ پڑھنے کی ضرورت اور نہ ہی مدرسہ کی حاجت۔ (حقیقی خطباء اور ذاکرین میری اس بات کے مصداق نہیں ہیں) جہاں عزاداری پر ہم کروڑوں بلکہ اربوں خرچ کرتے ہیں وہیں

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

کیوں؟ کیا یہ آیت پیغمبرؐ کے معصوم ہونے سے ہم آہنگ ہے؟

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی، آیت اللہ جعفر سبحانی مدظلہما العالی

سوال: اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے پیغمبرؑ گناہوں سے پاک ہیں تو پھر اس آیت میں پیغمبر کا گناہ بخشنے سے کیا مراد ہے؟

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا○ لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَاتَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکَ وَیَھْدِیَکَ صِرَاطًامُّسْتَقِیْمًا○

''ہم تمہارے لئے نمایاں فتح (فتح مکہ) وجود میں لائے تاکہ خدا تمہارے گزشتہ اور آئندہ گناہ بخش دے اور اپنی نعمت کو تمہارے حق میں کامل کردے اور تمہیں راہ راست کی جانب ہدایت کرے۔'' (سورہ فتح، آیت: ۱-۲)

جواب: پہلے تو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ تحریکوں کے بانی اور انقلابی اشخاص جو عام خیالات کے دھارے کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے ترقی پسندانہ پروگرام کے ذریعے روبہ انحطاط اور آلودہ معاشرے کی اصلاح کریں وہ پہلے قدم پر ہی مخالفتوں، الزام تراشیوں، ناروانسبتوں اور بے بنیاد تہمتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ تہمت لگانا ان حربوں میں سے ایک ہے جو پسماندہ معاشروں میں استعمال کئے جاتے ہیں اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے مصلح افراد اور شخصیتوں کو فکر کی کوتاہی اور اپنی کم ظرفی کی بنا پر تہمتوں اور ناروانسبتوں کے زہر آلود تیروں کا نشانہ بنایا جائے۔

پیغمبرؐ اسلام بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہ تھے۔ آپ کو بھی قریش کی مخالفت اور بے بنیاد تہمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس شخص کو کل تک قریش کی صادق، امین اور پرہیزگار ہستی مانا جاتا تھا اس نے جس دن ان کے پست خیالات کی مخالفت کی اور لوگوں کو خدا پرستی کی دعوت دی اسی دن سے اس پر جادوگری، کہانت، جنون اور خدا پر افتراء باندھنے کی تہمتیں لگائی جانے لگیں، اللہ تعالیٰ نے ان تہمتوں کو کفار قریش سے نقل کیا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اگر ایسی تہمتوں کا کچھ لوگوں پر اثر نہ بھی ہو تب بھی یہ سادہ لوح اور کم فہم لوگوں کے لئے پیغمبرؐ کی راست گوئی اور دعوے کے بارے میں شک وشبہہ کا باعث بنتی ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ لوگوں کا ایک گروہ ایک مدّت تک ان تہمتوں کے بارے میں شک، تردد اور دورائی کا شکار رہتا ہے۔

ان حالات میں یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ان تہمتوں کا ازالہ کیا جائے تا کہ حقیقت کا چہرہ ان اوہام کے گورکھ دھندے کے درمیان میں سے بے نقاب ہوجائے؟

اس کا ایک ہی مؤثر طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ایک اولوالعزم اور ترقی پسند شخص جو اجتماعی طرزِ فکر اور نصب العین کا علم بردار ہو اگر وہ کامیاب ہوجائے اور اپنا مقصد حاصل کرلے اور لوگ خود اپنی آنکھوں سے اس کی تحریک کے فوائد دیکھ لیں تو تمام تہمتیں اور الزام تراشیاں نقش برآب ہوجاتی ہیں اور ان تہمتوں کی جگہ کئی ایک اچھے القاب لے لیتے ہیں جو عظمت، قدرت اور معنویت کا مظہر ہوتے ہیں اور اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہو تو اکثر یہ تہمتیں بعض لوگوں کے ذہنوں میں مدت تک باقی رہتی ہیں اور کئی اشخاص کے بارے میں کارگر اور مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔

بالکل یہی بات پیغمبرِ اسلام کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ آپ نے ایک ترقی پسندانہ پروگرام اور کئی ایک ایسے تابناک قوانین کے ساتھ مقابلے کے میدان میں قدم رکھا جو عوام کے لئے تو منفعت بخش تھے لیکن حکومت کے خلاف جاتے تھے۔ آپ اس میدان میں اپنی آئندہ کامیابیوں کی خبر دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کی روشنی میں اور اپنی اور اپنے وفادار ساتھیوں کی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کی بدولت آپ نے تمام مشکلات پر قابو پالیا۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ شرک کا گڑھ اور ان الزام تراشیوں کی پیدائش کا مرکز مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور مکہ ایک درخشاں کامیابی کے طور پر فتح ہوگیا۔

یہ کامیابی جو اس امر کا سبب بنی کہ قریش اپنی تمام قوت کے ساتھ اسلام کے زیرِ حکومت اور اس کے قبضے میں آجائیں، اپنے دامن میں ایک اس سے بھی بڑا نتیجہ رکھتی تھی اور وہ یہ کہ جب یہ مردِ جری اس میدان میں سرخرو ہوگیا اور لوگوں نے اس کی جدّ و جہد کا بہترین نتیجہ واضح طور پر دیکھ لیا اور اس نے اپنے معنوی انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تو اس کامیابی کی روشنی میں دروغ گوؤں اور جھوٹی تہمتیں لگانے والوں کے منہ بند ہوگئے اس عظیم کامیابی کی موجودگی میں وہ اسے مجنوں اور دیوانہ یا ساحر اور کاہن نہیں کہہ سکتے تھے کیوں کہ وہ شخص جس میں اس قسم کے روحانی اور نفسیاتی نقائص موجود ہوں ایسا انقلاب برپا نہیں کرسکتا۔

لہٰذا مذکورہ بالا آیت میں ''ذنب'' سے مراد وہی ناجائز تہمتیں ہیں جو فتح مکہ سے پہلے تک قریش کے سادہ لوح افراد کے دلوں میں موجود تھیں اور اس کامیابی نے ان تمام ناروا نسبتوں کو باطل کردیا اور دنیا کے اس عظیم نجات دہندہ کے مقدّس دامن سے یہ بہتان دور ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہی صورتِ حال باقی رہتی جو فتح مکہ سے پہلے تھی اور رسول اکرمؐ مقابلے کے میدان میں کامیابی حاصل نہ کر پاتے تو تہمتیں بھی اپنی جگہ قائم رہتیں۔

اس تفسیر کی گواہی دو چیزیں دیتی ہیں:

۱۔ صریح طور پر یہ آیت یہ کہتی ہے کہ ہم فتح مکہ وجود میں لائے تا کہ اس کی روشنی میں تمہارے گناہ بخش دیئے جائیں۔

اگر گناہوں کی بخشش سے مراد تہمتوں اور ناجائز

الزام تراشیوں کا باطل کرنا ہی ہو جیسا کہ ہم نے اوپر بالتفصیل بیان کیا ہے تو پھر ان دو چیزوں یعنی ''فتح مکہ'' اور ''گناہوں کی بخشش'' کا ارتباط صحیح اور واضح ہوجاتا ہے کیوں کہ اس کامیابی نے تہمتوں کی تکرار کے بارے میں لوگوں کے منہ بند کردیئے اور پھر کسی کے آں حضرتؐ کو الزام دینے کا سوال باقی نہ رہا اور اگر ان سے مراد شرعی گناہ اور نافرمانیاں ہوں تو پھر ان گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ایک عسکری فتح اور ظاہری کامیابی نہیں بلکہ استغفار اور توبہ ہے۔

۲۔ آیت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ یہ فتح اور کامیابی گزشتہ اور آئندہ گناہوں کی بخشش کے اسباب وجود میں لائی اور یہ جملہ اسی صورت میں صحیح معنوں کا حامل ہوسکتا ہے جب اس سے مراد تہمتیں اور ناروا نسبتیں ہی ہوں یعنی یہ عظیم اجتماعی کامیابی اس امر کا موجب بنی کہ سابقہ تہمتیں زائل ہوجائیں اور آئندہ بھی کوئی ایسی تہمتیں نہ لگائے لیکن اگر اس سے مراد شرعی گناہ ہی ہوں تو پھر آئندہ گناہوں کی بخشش کا صحیح مفہوم برآمد نہیں ہوتا۔

(بقیہ خطباء، ذاکرین ـــــــــــــــــــــــ)

ایسی اکیڈمی اور ایسے مدارس کا قیام بھی عزاداری ہی کی خدمت کا حصہ ہیں ورنہ جس ڈگر پر آج ہمارا منبر چل رہا ہے اگر صورتحال کے آگے بند نہ باندھا گیا تو کچھ عرصے کے بعد منبر کا اللہ ہی حافظ ہوگا۔

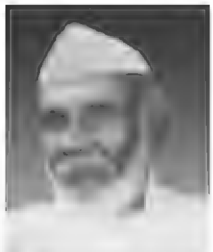
ہمارے بعض صوبوں میں تو یہ حال ہے کہ گانے بجانے والے محرم میں گانا بجانا چھوڑ کر منبر پر کودنا شروع کردیتے ہیں اور انہیں یہاں زیادہ پذیرائی ملتی ہے اور بقول ان کے گانے بجانے سے زیادہ انہیں ان دو ماہ میں عزت، شہرت اور دولت مل جاتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان سب کے بدلے انھوں نے اس قوم کو کیا دیا؟ تاریخی واقعات کو مسخ کرکے پیش کرنا، گڑھی ہوئی روایات کو پیش کرکے واقعہ کربلا کو دنیا کی نظروں میں مشکوک بنانا اور اپنی بے عملی کی توجیہہ وتاویل پیش کرنے کے لیے ساری قوم کو بے عملی راہ پر چلنے کی دعوت دینا۔

کیسے کیسے لوگ، منبر پر نظر آنے لگے
زیر منبر بیٹھئے، توہین منبر دیکھئے

آپ اس قوم کے دانشور ہیں، آپ کو ہی قوم کو اس دلدل سے نکالنا ہوگا۔ خدا بھی کسی قوم کی تب ہی مدد کرتا ہے جب وہ خود اپنی مدد کے لیے آمادہ ہو۔

آیئے ہم سب مل کر عہد کریں کہ اپنے عہد وفا کو پورا کریں گے، اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہوں گے اور اس مظلوم ملت کے خلاف ہونے والی ہر سازش کو ناکام بنادیں، آیئے اپنے جزئی اختلافات کو بھلا دیں اس طرح صف بندی کرلیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار بلکہ کربلا کی دیوار جس سے ٹکرا کر یزیدیت پاش پاش ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔

☆☆☆



اور۔۔۔۔۔۔۔فضائیں اداس ہوگئیں!!!

م۔ر۔عابد

شب شنبہ ۹رمحرم (شب عاشور باعتبار افق کربلا)۱۴۲۶ھ

لرزتا آفتاب غروب ہوچکا تھا۔۔۔۔سسکتا چاند مسافت شب درمیان سے ہی قطع کرکے ڈوب چکا تھا۔۔۔۔اور مغرب کی سمت سے دبے پاؤں آکر تاریکیاں مشرق پر چھا چکی تھیں۔۔۔۔۔۔۔صرف جھلملاتے تارے۔۔۔۔۔۔آنسو کے مانند۔۔۔۔۔۔شہید نور بنے شاید تاریخ سازی میں مصروف تھے۔۔۔۔۔۔اچانک کانوں میں ایک آواز ٹکرائی۔۔۔۔۔۔بجلی کی طرح۔۔۔۔۔۔کیا؟ کیا!! چودھری صاحب اُٹھ گئے!! اور۔۔۔۔۔۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

احساس سکتہ میں آیا۔ ذہن سُن ہوگیا اور فضائیں اداس ہوگئیں! عصری ذرائع ابلاغ کا ہونق چہرہ فق تھا۔۔۔۔۔۔تاریخ عصر نے مرثیہ لکھا۔عصر کی قسم،عصر عاشورہ یاد آ گیا۔

ایک عجیب ہستی سے زمانہ خالی ہوچکا تھا۔جی،وہ ہستی۔

وہ حقیقت ترجمان حسینی ہستی۔۔۔۔۔جس نے باطل کی بیعت نہ کی۔

وہ فرد فرید منفرد ہستی۔۔۔۔۔۔۔۔جو یکتائی کا استعارہ تھی،خودی کی تشبیہ اور خودداری کی مراد۔

وہ بھاری بھرکم شخصیت۔۔۔۔۔۔جس کا ثقل آگہی جہان دانشوری میں قابل قدر رہا،دیدہ وری کا میزان رہا۔

وہ ہمہ جہت ہمہ گیر مخلوق۔۔۔۔۔۔۔۔جس میں سماجی حیوان ناطق (حیوان کاتب) کی پیکر تراشی پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آئی۔

وہ مثالی سماجی ذات۔۔۔۔۔۔۔۔جس کے عمرانیات کسی بھی اختلافی کشیدگی کی پرواہ نہ کر حُسن اجتماعیت کی زلفیں سنوارا کئے،جس کے اقدام ہمدردی اور مددگاری کے معنی ابھارا کئے۔

وہ صاف گوئی کا بے باک مرقع۔۔۔۔۔۔جس کا اچوک، بے ٹوک اور بے لاگ تبصرہ کسی قریب و دور،عزیز و بے تعلق، یگانہ و بیگانہ میں امتیاز وتفریق نہ کرتا اور وہیں جس کی نکتہ رس، کشادہ نظر داد تحسین ہر ثقافتی، سماجی حد بندی اور ڈکورم(Decorum) کو پار کرلیا کرتی۔

بیدار مغزی کا وہ پیر مغاں۔۔۔۔۔جس کے ذہن کو متاثر کردینے کی کسی بھی قسم کے حادثہ میں سکت نہ تھی۔

احترام وسرفرازی کا وہ بلند قامت جیالا۔۔جس کا سر جھکنا نہ جانتا تھا،جس کے قدم ڈگنا نہ جانتے تھے اور جس کا قلم بکنا نہ جانتا تھا۔

آج وہ یک قلم فطرت کے ایک پرانے جانے پہچانے فیصلہ کے سامنے خم ہوگیا۔تسلیما لامرہ کا خاموش زندہ طغرہ بن گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور دنیا کی طرح بے چوں وچرا وہ اٹل فیصلہ مان گیا جو کبھی بدلا نہیں کرتا۔

وہ کھدر دھاری عالم دین۔۔۔۔۔۔۔۔جس کی ہمہ دانی جانی مانی تھی اور جہان علم وآ گہی میں معنی رکھتی تھی،

جس کا فرمایا ہوا استناد کا مترادف ہوتا،

جس سے علم وفضل کو استخارہ تھا۔ جس کے آگے سیاست مدنی کے دِگج سجدہ کرنا فخر وشرف سمجھتے اور

کھیلتی تھی جس کی ٹھوکر تاج سلطانی کے ساتھ۔

آج وہ پیوند خاک ہوگیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔علم وتدبر کا ستون زمین پر گر گیا۔

گیان ستنبھ دھراشائی ہوگیا۔

وہ ادیب اریب، فاضل نبیل، حَبر بصیر، نقاد نکتہ بیں، مبلغ توحید، وحید زمان، عمید جہاں، مجاہد آزادی، صاحب طرز صحافی، جرات نگارش، شان بنشین، فخر ملت، معین قوم، امین اقدار، ثمین کردار، مجد افکار، امجد تاریخ، شہکار فراست،۔۔۔۔۔۔۔۔۔چل بسا۔

اکبر پور نے تاریکیاں بکھیر دیں۔ ملک سکتہ میں ہے۔دنیا اداس اداس ہے۔

آج جہان علم وقلم یتیم ہوگیا۔ ہم غرق تاسف ہیں۔ اس کی پہچان نہ کرسکے، اس کی قدر کیا کرتے۔شاید صنادید عالم کی یہی تقدیر ہوا کرتی ہے۔

میں نے اسے دیکھا تھا، اپنا یہ شرف مجھے صدیوں پر فخر کرنے کا سرمایہ دے گیا۔ یہی نہیں اس نے مجھے بھی دیکھا۔۔۔میرے شکستہ ذہن کو پڑھا اور میرے مفلسِ آگہی قلم کو اپنے تبصرہ کا ہدف بھی بنایا۔ اس کے اور میرے درمیان ہر طرح کے فرق وبُعد کے باوجود اس نے احساس قرب دیا۔آج اسی احساس سے اپنا من بوجھل ہے۔

وہ تو چلا گیا۔لیکن جاتے جاتے اپنی پسماندہ قوم کا امتحان لیتا گیا۔ حقوق العباد کے اس نمایاں علم بردار، سماج کے سورما، سوشلزم کے رہنما کے حق سے ہم کہاں تک ادا ہو پائیں گے، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ابھی تک تو مایوسی اور حسرت کے سوا کچھ نہ ظہور میں آیا۔ پھر بھی اگر قوم ناامید کربھی دے تو قلم اپنے کسی محبوب کو Unhonoured, unwept, unsung نہیں رہنے دیتا۔آج نہیں تو کل قلم اس کی ''جے'' بولے گا

कलम आज उनकी ''जय'' बोल
अन्धा चका चौंध का मारा,
क्या जाने इतिहास बेचारा।
साक्षी उनकी महिमा के है,
सूर्य, चन्द्र, भुगोल, खगोल।
कलम आज उनकी ''जय'' बोल।।

قلم آج ان کی جے بول
اندھی چکا چوندھ کی ماری　کیا جانے تاریخ بے چاری
شاہد ان کی عظمت پر ہیں　سورج، چاند، کرۂ ارض وسما
قلم آج ان کی جے بول

نعتیہ غزل

علامہ ماہؔی جائسی

نبی سے واسطہ رکھنے میں دل سے کام لیتا ہوں
میں، اے روح الامین! کب آپ سے پیغام لیتا ہوں

یہ کیا ہے روضۂ رضواں چلا جاؤں گا دم بھر میں
ابھی تو روضۂ شہ پر ذرا آرام لیتا ہوں

سرورِ بادۂ حُبّ نبیؐ ہوتا ہے جب کامل
جب اہل بیت کی الفت کا بڑھ کر جام لیتا ہوں

ریاضت کے ثمر روضے پہ شہ کے پختہ ہیں رضواں
کب اُن کو چھوڑ کر میں تیری جنسِ خام لیتا ہوں

ملک سجدہ سمجھتے ہیں مگر میں تو حقیقت میں
پلک سے خاکِ پائے بانی اسلام لیتا ہوں

صراطِ معرفت پر ہوں اگر لغزش بھی ہوتی ہے
تو گوشہ دامنِ آل عِبؑا کا تھام لیتا ہوں

چل اے ماہؔی تماشا کر کہ باب علم کے در سے
میں نعتیہ غزل بہر صلائے عام لیتا ہوں

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سید الشعراء مولوی سید محمد حسن سالک مرحوم

زمانے میں سحر پیدا ہوئی شام قیامت کی
ستارے چھپ گئے پھوٹی کرن مہر نبوت کی

خدا جانے کشش کتنی ہے اس نام محمدؐ میں
سنا جس نے کوئی ہو؟ اس نے بے دیکھے محبت کی

اسی سے تو ہوا ہے خلق نور فاطمہ زہراؑ
ضرورت تھی خدا کو سایۂ جسم رسالت کی

ازل کی بزم میں کہنا پڑا ہر ایک مرسلؑ کو
محمدؐ ہیں کہ اک تصویر ہے خلق ومروت کی

ہزاروں انبیاء آئے ازل سے اس زمانے میں
مگر خالق نے احمدؐ ہی پہ تکمیل رسالت کی

محمدؐ، مرتضیٰ و فاطمہ ، شبیرؑ اور شبرؑ
یہ پہلے نقش پہلی صنعتیں ہیں دست قدرت کی

مہک اُٹھا گل جنت مشام جاں معطر ہے
دل مومن کھلا سن کر خبر تیری ولادت کی

چمک اُٹھی ازل کے دن جبین حضرت آدمؑ
ضیا پہونچی کہاں تک گوہر تاج نبوت کی

ملک سجدوں میں جھکنے ہی کو تھے خالق کے دھوکے میں
تجلی تیرے رخ کی تھی کہ تھی تصویر قدرت کی

وہ نقش کن فکاں تم ہو، وہ قرآن مبین تم ہو
تمہارے نور سے رونق بڑھی بازار قدرت کی

جو ذات پاک ختمی مرتبتؐ ہے کوئی کیا جانے
امانت سونپ دی اللہ نے اپنی شریعت کی

علامہ ماتیؔ جائسی

قصیدہ

بحضور سیّدی ومولائی جناب امام جعفر صادق علیہ السلام

منتہی دونوں کا ہے منزلِ عرفان ویقیں
کفر اک راہ کو کہنے لگے اک راہ کو دیں

گام زن مرحلہ در مرحلہ ہیں جن وبشر
سب ہیں مصروفِ سفر کوئی کہیں کوئی کہیں

کوئی اصنام کو سنگِ سر منزل سمجھا
حبلِ توحید بنی ایک کا سررشتۂ دیں

ایک نے کوہ گزیں ہونے کو رفعت جانا
ایک کا سجدہ رسا تابہ سر عرشِ بریں

خستہ سرگشتہ کوئی تاسر منزل پہنچا
کوئی آسودہ وبشاش ہے منزل کے قریں

مضطرب ہے، متاسف ہے، کوئی نالہ بلب
مطمئن ہے، متبسم ہے، کوئی خندہ جبیں

سر بزانو کوئی آزردۂ پاداشِ عمل
شاد ہے کوئی خوش اعمال بہ فردوس بریں

آج تو عادلِ مختار کو سمجھے دونوں
اب تو ہے واحد قہار کا دونوں کو یقیں

ایک کا مایۂ نازش ہے طریقِ جعفر
راہ کج دوسرے کے واسطے وجہ نفریں

شان میں ہادی سادس کے سنو مطلعِ نو
کہ بنے موجبِ افزائش انوارِ یقیں

نیّر فیض سے جعفر کے ہے روشن رہ دیں
ان کی ممنون ہے احکام خدا کی تدویں

حق پرستی کے لئے مایۂ نازش ہے یہ ذات
نام ہی ہوگیا صادق وہ صداقت آئیں

جلوہ گر روئے منوّر میں جمالِ نبوی
جو ہر تیغ یداللہ ہے یا چینِ جبیں

مظہر خلقِ حسنؑ حسنِ تبسّم اُن کا
سر بسر شانِ حسینی ہے سراپائے حسیں

مرکز طوف نہ افلاک بنا گنبد قبر
موجب فخر ہے بنیاد حرم بہر زمیں

ذات معبود کہ موجود مشہود نہیں
اس کی ہستی کا عطا کردیا منکر کو یقیں

مادیت سے ہیں ماخوذ ثبوتِ الحاد
قلب انساں میں سہولت سے جو ہوں جائے گزیں

اب رہا عالمِ تجرید، سو اُس کا ہے یہ حال
کہ جوکچھ بھی ہو وہاں قابلِ ادراک نہیں

ان فضاؤں سے اگر لا بھی سکے کوئی دلیل
کون سمجھے اُسے اور کیا ہو سبیل تلقیں

تجھ پہ میں اور مرے ماں باپ فدا ہوں مولا
روحِ تبلیغ ہے تلقیں کا یہ مُسکِت آئیں

عمقِ قلب میں ملحد کے چھپا تھا جو راز
کی بہ اعجاز اسی راز سے اس کی تسکین
واقعہ یہ ہے کہ پوچھا یہ شہِ والا نے
کبھی دریا میں ہوا ہے تو ہلاکت کے قریں
سُن کے اقرار، امامِ دوجہاں نے یہ کہا
پھر ترے دل نے سہارا کوئی چاہا کہ نہیں
ہوچکا معترف اس کا بھی تو ارشاد ہوا
جس سے اس وقت بھی تھی آس وہ ہے ربِ معین
فاش کرتا ہے اب اک مطلع نو سے ماتیؔ
رازِ تسخیر عناصر بہ سماوٗ بہ زمیں
نقش سے نام پر اعجاز کے اے سرورِ دیں
ہے مزیّن بن داوٗد کی خاتم کا نگیں
اور تو اور، شہا! بوذر وسلماں کے لئے
خوشہ چینی ترے گلزار کی برگِ تمکیں
میں گنہ گار، کہاں سر کو جھکاؤں اللہ!
درِ مولا پہ ہے معصوم فرشتوں کی جبیں
ہے بہر حال اسی در کا تصوّر دل میں
سر کو اب عالمِ معنی میں جھکاتا ہوں وہیں
تجھ کو حالات کا بھی علم ہے حاجات کا بھی
شرح وتفصیل کی یا شاہ ضرورت ہی نہیں
میں یہ سمجھوں کہ مجھے دولت دارین ملی
ہو اگر اک نگہہ لُطف سوئے عبدِ حزیں

نعت مرسل اعظمؐ

ندیٰ الھندی

مرے سرکار ہے دنیا کی عزت آپ کے در سے
فلک نے بھیک میں پائی ہے رفعت آپ کے در سے
نہیں ہے بے سبب دنیا کو الفت آپ کے در سے
ہے وابستہ زمانے کی ضرورت آپ کے در سے
مریضان ولائے مرتضیٰ بے حد توانا ہیں
عجب انداز سے بٹتی ہے صحت آپ کے در سے
ہمیں لا تقنطوا من رحمة الله پر عقیدہ ہے
کنیزوں کو ہے امیدِ شفاعت آپ کے در سے
عدوئے جاں سے بھی ہمدردیاں کیا خوب سیرت ہے
جہاں لے درسِ معیارِ شرافت آپ کے در سے
جنھیں جانا ہے جنت آئیں وہ سب آپ کے در تک
کہ دیکھا جا رہا ہے بابِ جنت آپ کے در سے
یہی لگتا ہے جیسے دولت کونین پائی ہے
بہت ہی خوش ہیں پابندِ محبت آپ کے در سے
ہیں سردار جوانان جناں جب آپ کے گھر میں
تو پھر بیشک ملے گی سب کو جنت آپ کے در سے
خدا رکھے درِ جود وکرم ہے آپ ہی کا در
وہ کافر ہے جسے ہوئے شکایت آپ کے در سے
جسے بھی آپ کے در سے محبت ہے وہ زندہ ہے
وہ ہے مردہ جسے بھی ہے عداوت آپ کے در سے
فساد و انتشار وتفرقہ کی نذر تھی دنیا
زمانے کو ملا پیغام وحدت آپ کے در سے
ندیٰ الھندی سوالی ہے تو بیشک آپ کے در کی
اُسے ملتا ہی ہے حسبِ ضرورت آپ کے در سے

فضائل حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

امتیاز الشعراء مولانا سید محمد جعفر قدسیؔ جائسی

اوجھل نہ ہو نگاہ سے قاتل خدا کرے ہر وقت میرے حلق پہ خنجر چلا کرے
قسمت سے دل نشیں ہو جو اُن کی نگاہِ ناز دل پھر کبھی نہ تیر کا پیکاں جدا کرے
سمجھائے کس طرح دلِ حرماں نصیب کو ہوتی نہ ہوں جفائیں بھی جس پر وہ کیا کرے
برق اور برقِ حُسن سے چشمک خدا کی شان سرمہ ہو آپ اگر ابھی یہ حوصلہ کرے
آجائے میرا ذکر جو ان کی زبان پر سارا زمانہ پھر تو مرا تذکرہ کرے
صورت یہ ہوگئی ہے مریض الم کی اب دشمن بھی دیکھے ایک نظر تو دعا کرے
آراستگیٔ زلف میں الجھے ہوئے ہیں وہ غم اپنے مرنے والوں کا ان کی بلا کرے
قدسیؔ غزل سناؤ کہ دل بے قرار ہے تم کو سکونِ قلب عطا کبریا کرے
آنکھوں سے خون روئے کہ دل سے دعا کرے بیمارِ عشق جو ہو الٰہی وہ کیا کرے
وہ شوق سے جفا پہ جفا برملا کرے عاشق کی کیا مجال کہ منہ سے گِلہ کرے
وہ کُشتۂ غم والم اللہ کیا کرے جس کے گلے پہ روز ہی خنجر چلا کرے
میں ہوں وہ شوخ ادا ہو گلستاں ہو ابر ہو دل کا شکار مثلِ بطِ مَے ہوا کرے
آئے ہیں وقت نزع میں جی بھر کے دیکھ لوں قسمت سے زندگی بھی اگر کچھ وفا کرے
روتا رہوں اگر میں کسی گل کی یاد میں ابر بہار شرم سے پانی بھرا کرے
رعنائیاں وہ ہیں کہ اگر دیکھے اک نظر گُل اس بہارِ حُسن کا کلمہ پڑھا کرے
آئینہ اُن کے سامنے وہ آئینہ میں ہوں دونوں طرف سے چوٹ برابر چلا کرے
وہ ہوں اور اُن کے ساتھ ہوں اُن کی جفائیں بھی کوئی جفا کرے کوئی شکرِ خدا کرے
سمجھوں گا میں کہ بعد فنا بھی ہے رابطہ تربت پہ فاتحہ پڑھے وہ یا جفا کرے
گذرے وہ دن کہ مجھ کو بھی تھی آرزوئے عشق دل ہی نہیں تو خاک کوئی حوصلہ کرے
دو حرف کن کے کس نے کہے اور کیوں کہے واں بولنا محال کوئی شرح کیا کرے
جو چاہتا ہو رازِ محبت کا انکشاف جان اپنی عشقِ شاہِ زمن میں فدا کرے

سُلطانِ دیں امامِ مبیں فخر مرسلیں
بھٹکے ہوؤں کو ہادی راہِ خدا کرے

سردارِ کائنات۔ مقلب قلوب کا
گردن کشوں کو سالکِ راہِ رضا کرے

ذی اختیار۔ صاحب اعجاز واقتدار
پتھر کو لعل۔ خاک کو سیم وطلا کرے

حیدرؑ کا نورعین پیمبرؐ کے دل کا چین
فخر اس پہ کیوں نہ حضرت ربّ علاکرے

اُس کے شرف کی حد کا خدا ہی کو علم ہے
توصیف جس کی بادشہ انبیاء کرے

کیا اس کے باب میں کوئی چون وچراکرے
جس کو خدا امام کرے پیشوا کرے

اندازہ ہی جسے نہ ہو اس کے وقار کا
اُس کی ثنا اگر وہ کرے بھی تو کیا کرے

وہ بندگی میں کیوں نہ رہے داور اقتدار
اللہ جس کو مالکِ ارض وسما کرے

یہ مظہر صفاتِ کمالیّۂ الٰہ
جو چاہے وہ خدا کی قسم برملا کرے

یہ باعثِ وجودِ جہان وجہانیاں
جو کچھ کرے۔ قبول اُسے ربِ علا کرے

اللہ اس کو بخش دے جو کچھ بھی کم ہے وہ
جس کے لئے خدا سے یہ بندہ دُعا کرے

ہر طرح کا کریم نے بخشا ہے اختیار
چاہے تو عاصیوں کو بھی جنت عطا کرے

ویراں وہ گھر رہے نہ جلے جس میں شمعِ عشق
برباد ہو وہ دل جو نہ اس سے وِلا کرے

پھوٹے وہ آنکھ جس کو نہ ہو اس کا شوقِ دید
گونگی ہو وہ زباں جو نہ اس کی ثنا کرے

اللہ کو گذشتہ وآئندہ کا ہے علم
ناز ایسے بندے پر وہ نہ کیوں کر بھلا کرے

یہ کردگار قدرت ونائب مناب حق
جو کچھ نہ ہو نصیب میں وہ بھی عطا کرے

مختار کارخانۂ قدرت ازل سے ہے
جو چاہے تا ابد یہ ولیِّ خدا کرے

تاج سر شرف ہے وہ سرتاج افتخار
جس کی ثنا رسولؐ کرے کبریا کرے

قدسیؔ مبارک آپ کو مدحت سرائیاں
اللہ سب کو ایسا نصیبہ عطا کرے

مدح امامِ دیں میں وہ مطلع سنایئے
جو اہل دل کا جوشِ محبت سوا کرے

آئینہ شانِ قدرتِ ربّ علا کرے
ظاہر جو اختیار فنا وبقا کرے

کلمہ پڑھے امامِ دو عالم کا اک جہاں
دم بھر کو اپنا قہر اگر رونما کرے

عالم سے بے نیاز کا دل جس پہ آگیا
اُس کا فریفتہ نہ ہو عالم تو کیا کرے

زندہ کئے مسیحؑ نے مُردے زبان سے
ٹھوکر سے یہ حیات خضرؑ کی عطا کرے

واللہ اس کی مدح کا یارا نہیں مجھے
ممدوح کبریا کی ثنا کوئی کیا کرے

موسیٰؑ ہے نام۔ موسیٰؑ عمراں کا فخرہ
باتیں خدا سے چاہے تو بے واسطہ کرے

کاظمؑ لقب ہے۔ کنیّت پاک ابوالحسنؑ
حیدرؑ کی طرح کیوں نہ یہ کارِ خدا کرے

جب چاہے دو جہان کی مشکل کشائیاں
مثل ابوالحسنؑ علی مرتضیٰؑ کرے

کوئی نہیں ہے اس کے سوا اہل بیت میں
زندانِ غم سے موت ہی جس کو رہا کرے

اس کا شباب وشیب گزر جائے قید میں
ہارون کچھ خیال نہ وا حسرتا کرے

جس کا جہاں میں کوئی مددگار ہی نہ ہو
وہ کس سے حال دل کہے کس سے گلہ کرے

خنجر کا کام زہر دغا سے جو لے شقی
زنداں میں پھر اسیر نہ کیوں کر قضا کرے

بندے ہوں اس کے در پہ آزا رہے غضب
اللہ دو جہاں کا جسے مقتدا کرے

کردے نہ کیوں رجب کو محرّم پھر اس کا داغ
جب نورعین سبطِ پیمبرؐ قضا کرے

اس مبتلائے غم کی مصیبت خدا گواہ
بغداد کی زمین کو بھی کربلا کرے

یہ نور حق ہے جلوہ فگن کاظمینؑ میں
کیوں اس زمیں پہ رشک نہ عرشِ علا کرے

ہو جائے رشک اہل جناں میری آخرت
اس کا جوار لطف میں پاؤں خدا کرے

اے چارہ ساز عالم واے کردگارشاں
تیرا اُمیدوار کہاں جائے کیا کرے

میری طرف بھی جلد خدا را نگاہِ لطف
تا چند ضبط ایک اسیر بلا کرے

تیرے سوا کوئی نہیں قدسیؔ کا دست گیر
پابند غم پہ تو ہی کرے تو عطا کرے

واقف ہے تو کہ کوئی نہیں چارہ سازِ دل
جز تیرے کون درد کی آخر دوا کرے

نعت پاک

جناب سید مہدی رضا ایڈوکیٹ رضاؔ ماہلی

عظمتوں والا محمدؐ سے بڑا کوئی نہیں
انبیا لاکھوں ہیں محبوبِ خدا کوئی نہیں

یوں گئے بیت الشّرف سے عالم افلاک تک
بیچ میں دونوں کے جیسے فاصلہ کوئی نہیں

جس پہ خود چل کر حبیب کبریا دکھلا گئے
اُس سے بہتر زندگی کا راستہ کوئی نہیں

کون رکھتا ہے محمدؐ کی مکمل معرفت
اک علیؑ ہیں اک خدا ہے تیسرا کوئی نہیں

نسل آدم کو پڑھایا آدمیت کا سبق
محسنِ انسانیت تجھ سے بڑا کوئی نہیں

اے غریبوں کے مسیحا بے کسوں کے چارہ ساز
تجھ سے بہتر خلق کا حاجت روا کوئی نہیں

آپ کی تبلیغ سے ایمان ہے توحید پر
ورنہ دنیا مل کے کہہ دیتی خدا کوئی نہیں

ڈھال لے اسلام کے سانچے میں اپنی زندگی
ورنہ ان کے تذکرے سے فائدہ کوئی نہیں

پیکر نورِ خدا کو اپنے جیسا کہہ دیا
خر دماغی کی زمانے میں دوا کوئی نہیں

مشکلوں میں پڑھ کے دیکھا ہے رضاؔ نادِ علیؑ
اس سے بہتر حربۂ ردِّ بلا کوئی نہیں

م۔ر۔عابد

آہ!! آگہی!! آہ! چودھری!!

(مع تاریخ وفات فاضل نبیل ادیب اریب چودھری سید سبط محمد صاحب نقوی اعلی اللہ مقامہ)

کیا ہوا! مرجھائی جاتی ہے دلوں کی انجمن　　کیا ہوا؟ احساس میں چھلتی ہی جاتی ہے چبھن
کیا ہوا! ماحول میں گھُلتی ہی جاتی ہے گھٹن　　کیا ہوا؟ سمتوں کو چکراتے ہی جاتے ہیں گہن
کیا کوئی لمحہ چھٹک کر زندگی پر چھا گیا!
کیا کہیں تاریخ کے دھارے کو چکر آ گیا!!

کیوں نہ پھیلے یوں تاثر، کیوں نہ تڑپا جائے رات　　کیوں نہ اُٹھ جائے سکوں، اور کیوں نہ گھٹ جائیں جہات
کیوں نہ ہو اندھیر دنیا، کیوں نہ ہَو لے کائنات　　کیوں نہ سکتہ میں زمانہ ہو، نہ کیوں سسکے حیات
چل بسا ہے فرد دوراں، زندگی خاموش ہے
اُٹھ گیا ہے چودھری کیا، آگہی خاموش ہے

وہ سیاست کا گرو تھا، راج نیتا، چودھری　　صائب الرائے، مدبر، وہ مدیر والمعی
وہ صحافت کا مربی، وہ خبر کا سامری　　وہ تواضع کا دھنی تھا، وہ تبحر سے غنی
نازشِ ہندوستان تھا، فخر اکبرپور تھا
وہ اودھ کی شان تھا، وہ لکھنؤ کا نور تھا

وہ زبانوں کا شناسا، حاکم لفظ وبیاں　　وہ ادب پرور، مودب، وہ ثقافت کا نشاں
وہ مورخ، وہ مصنف، وہ قلم کا رازداں　　وہ مددگار تعلم، جستجو کا آشیاں
منفرد تھا، وہ فرید دہر تھا، وہ فرد تھا
اک عجب آزاد انساں تھا، بڑا ہمدرد تھا

قافیہ احساس کا تھا، سجع جذباتِ سَنی　　وضع داری کا تتمہ، پیش لفظِ زیرکی
صاف گوئی کا مرقع، پیکرِ زندہ دلی　　تیکھے لہجے کا صحیفہ تھا، ادب کا مصحفی
کج کلاہی کی علامت، بانکپن کی شان تھا
درد کا مضموں بھی تھا، انسانیت عنوان تھا

استعارہ علم کا تھا، استخارہ قوم کا   کلمۂ حصر خرد تھا، عطف تہذیب وادا
مصدرِ الطاف تھا، وہ مشتقِ فہم وذکا   معنیٔ اصلاح تھا، نکتہ رسی کا قاعدہ
رہبرِ قوم ووطن تھا، دین کا ہادی بھی تھا
سورما تھا، جنگ آزادی کا سینانی بھی تھا

قدردانی کا مضارع، صیغۂ اقدار تھا   جمع اوصاف حمیدہ، واحدِ کردار تھا
طالع بیدار تھا، وہ مطلعِ افکار تھا   مرجعِ تحقیق تھا، تنقید کا معیار تھا
قدرِ گوہر جانتا تھا، جوہری تھا، شاہ تھا
صدرِ بزمِ فضل تھا، رونق فزائے جاہ تھا

وہ بزرگی کا نشاں تھا، برگزیدہ تھا، اُٹھا   دیدہ ور دانشوری کی آبرو تھا، چل دیا
منکسر، خوددار، وہ کیسی خودی میں رم گیا   وہ خدا والا، خدائی کا فدائی کیا ہوا
ہاں یقیں سے وقت ہے اب ضامنِ باغ جناں
آج ہوئے سبط محمد ساکنِ باغِ جناں

۱۴۲۶ھ

دیگر تاریخیں

☆ تربت پاکباز چودھری سبط محمد

۱۴۲۶ھ

☆ یہ ہے تربت چودھری کی فاتحہ پڑھ جائیے

۲۰۰۵ء

☆ چودھری سید سبط محمد نقوی مکین خلد ہو گئے

۱۴۲۶ھ

☆ وہ سورج آگہی کا تھا جواب غروب ہو گیا

۲۰۰۵ء

☆ ایک آفتاب علم وکمال اب غروب ہو گیا

۲۰۰۵ء

خبرنامہ

ادارہ



انقلاب اسلامی ایران سے آج بھی دنیا پریشان ہے : آقا علی رضائی صاحب

لکھنؤ۔ ۹ر فروری انقلاب اسلامی ایران کی چھبیسویں سالگرہ کے موقع پر دیر رات تک چلے ایک سیمینار میں مہمان خصوصی ایران سے آئے حجۃ الاسلام آقا علی رضائی نے کہا کہ اسلامی انقلاب ایران کی کامیابی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ آج تک دنیا اس سے پریشان ہے اور حضرت آیۃ اللہ خمینیؒ نے جو پیغام دیا تھا اس کے خلاف اسلام کے دشمن پانی کی طرح پیسہ خرچ کر رہے ہیں۔

نور ہدایت فاؤنڈیشن کی جانب سے نایاب پیلیس میں ''انقلاب اسلامی ایران کے عالمی اثرات'' موضوع پر منعقد سیمینار میں آگے انھوں نے کہا کہ آج انقلاب کے معنی و مفاہیم کو درست طور پر نہیں پیش کیا جا رہا ہے۔ جب کہ اس لفظ کا صحیح مفہوم اسی وقت سامنے آسکتا ہے جب ہم اسلام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں۔ انھوں نے کہا کہ اسلامی جمہوری ایران کے قیام کا مقصد اسلامی قدروں کا تحفظ تھا جب کہ مغربی طاقتیں آج انہیں قدروں کو پامال کرنے پر کمر بستہ ہیں اس لئے مسلمانوں میں اتحاد کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے۔ اگر ایک ارب مسلمان ایک آواز ہو جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کے آگے ٹھہر نہیں سکتی یہی امام خمینیؒ کا مشن تھا۔

آقا رضائی صاحب نے آیۃ اللہ خمینیؒ کا ایک قول نقل کرتے ہوئے کہا کہ اگر اسلام کی بہت زیادہ مخالفت ہوتی نظر آئے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام صحیح راستے پر چل رہا ہے۔

نور ہدایت فاؤنڈیشن کے روح رواں مولانا سید کلب جواد صاحب نے کہا کہ جسم اور روح کے اتحاد کا نام زندگی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا اتحاد ختم ہوتے ہی انسان موت کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ سورج زیادہ گرم ہے لیکن زمین تک پہنچتے پہنچتے اس کی کرنیں منتشر ہو جاتی ہیں نتیجے میں ان کا اثر کم ہو جاتا ہے لیکن جب آتشی شیشہ ان کو متحد کرتا ہے تو وہ آگ تک لگا سکتا ہے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں مولانا کلب جواد صاحب نے اتحاد کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اتحاد دنیا کی سب سے بڑی قوت کا نام ہے تین کروڑ مسلمان اگر متحد ہو کر ایران کی جابر حکومت کا تختہ پلٹ سکتے ہیں تو دنیا کے ایک ارب مسلمان متحد ہو کر دنیا کی تمام سپر پاوروں کا نقشہ بدل سکتے ہیں۔

پروگرام کا آغاز مولانا صابر علی عمرانی صاحب مدرس جامعۂ امامیہ تنظیم المکاتب نے تلاوت کلام پاک سے کیا اور نظامت کے فرائض شکیل حسن شمسی صاحب نے انجام دیئے۔ سیمینار کے کنوینر سید مصطفی حسین نقوی اسیفؔ جائسی نے آئے ہوئے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور اس سیمینار کو کامیاب بنانے والے حیدر علی، افروز آغا وغیرہ کی کوششوں کو سراہا اور امید کی کہ نور ہدایت فاؤنڈیشن کی جانب سے آئندہ بھی منعقد ہونے والے پروگرام اسی طرح کامیابیوں کی منزل پر گامزن رہیں گے۔

سیمینار میں شرکت کرنے والے علماء و دانشوروں میں مولانا حیدر مہدی، مولانا ممتاز جعفر، مولانا سیف عباس، مولانا امیر حیدر، پروفیسر خان محمد عاطف، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی کے شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر عین الحسن، مولانا محمد سعد نقوی، حسنین عابدی، مولانا محمد عباس، شیعہ انٹر کالج کے مدرس طالب زیدی صاحبہم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا کلب صادق صاحب کو امریکا میں داخلے کی روک پر شیعوں کا مظاہرہ

۲۵؍مارچ۔مولانا کلب صادق صاحب کو امریکا میں داخل ہونے سے منع کر دینے پر شیعوں نے بعد نماز جمعہ آصفی مسجد کے باہر ایک زبردست مظاہرہ کیا اور امریکا مخالف نعرے لگائے اور مطالبہ کیا کہ حکومت ہند بھی امریکیوں کے ساتھ ایسا ہی کرے۔

مولانا کلب جواد صاحب نے نماز جمعہ کے خطبے میں ہزاروں نمازیوں کو تعلیمات اسلامی کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ مولانا کلب صادق صاحب اور گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی دونوں کے ویزا منسوخ کرنے میں فرق کرنا چاہئے۔مودی ایک سیاست داں ہیں جب کہ مولانا کلب صادق صاحب مولانا اور مذہبی رہنما ہیں لہٰذا امریکا کا یہ اقدام شیعوں کے لئے باعث توہین ہے۔انھوں نے کہا کہ اس سلسلہ میں جب مولانا کلب صادق صاحب لکھنؤ لوٹیں گے تب حکمت عملی وضع کی جائے گی۔انھوں نے کہا کہ فرقہ وارانہ اختلاف پیدا کرنے کے نام پر بعض مولوی ایک پارٹی سے اس کی قیمت وصول کر رہے ہیں ان سب باتوں کے سامنے آنے پر قوم کے لوگوں کو ان سے دور رہ کر اس کا فیصلہ کرنا چاہئے۔

مولانا کلب جواد صاحب نے کہا کہ وقف سلطنت بیگم کی زمین پر تعمیراتی کاموں کے سلسلے میں شیعہ وقف بورڈ کے چیرمین جناب مختار انیس نے ان سے ملاقات کی اور انہیں یقین دہانی کرائی کہ تین دن کے اندر غیر قانونی تعمیراتی کاموں کو روک دیا جائے گا۔مولانا نے کہا کہ اگر تین دن میں یہ نہ روکا گیا تو آئندہ جمعہ اس کے خلاف مظاہرہ کیا جائے گا۔مولانا نے آج اپنی جان کے خطرے کا بھی اندیشہ ظاہر کیا انھوں نے کہا کہ ضلع انتظامیہ کے اشارے پر کام نہ کرنے کے سبب جہاں ضلع انتظامیہ ان کی جان کی دشمن ہے وہیں وقف املاک کو خرد برد سے بچانے کی مہم چلانے پر اوقاف پر قبضہ کرنے والے ان کی جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔اس کے علاوہ وہ لوگ بھی جو مشتعل تقاریر کرتے ہیں کیوں کہ میں برابر ہی ان کے خلاف رہتا ہوں۔انھوں نے کہا کہ اگر قوم کے لوگ مجھے منع کر دیں کہ میں قوم کے معاملے میں نہ آؤں تو میں ان کے کہنے پر عمل نہیں کروں گا۔

سانحۂ ارتحال

عالم باعمل حجۃ الاسلام مولانا سید عابد رضوی صاحب کراروی مرحوم احمد آباد گجرات سے وطن کراری الہ آباد میں پہنچنے کے بعد ۵؍فروری ۲۰۰۵ء کو شب میں چھت پر جا کر موبائل سے فون کرنے کی کوشش کر رہے تھے اسی درمیان وہ چھت سے نیچے گر گئے، سر میں شدید چوٹ آئی ہنسلی کی ہڈی شکستہ ہوئی ۶؍فروری سے بے ہوشی کی حالت میں مویو ہسپتال لکھنؤ میں داخل کئے گئے لمبی بے ہوشی کی حالت میں ۲۲؍فروری کو وہ اس دار فانی سے دار بقاء کا سفر کر گئے۔مولانا موصوف کا جسد خاکی وطن میں ہی سپرد لحد کیا گیا۔

اراکین نور ہدایت فاؤنڈیشن اس بزرگ عالم دین کے انتقال پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے پسماندگان کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہوئے قارئین شعاع عمل سے مولانا مرحوم کے لئے سورۂ فاتحہ کی درخواست کرتے ہیں۔

لکھنؤ میں ایام عزا کا پرامن طریقے سے اختتام!
چپ تعزیہ کا جلوس عقیدت واحترام سے نکالا گیا

ایام عزا کی آخری شب شہادت امام حسن عسکریؑ عقیدت واحترام کے ساتھ منایا گیا اور ۸؍ربیع الاول کی صبح کو چپ تعزیہ کا جلوس وکٹوریہ اسٹریٹ پر واقع امام باڑہ ناظم صاحب سے بڑے احترام سے نکالا گیا جو روضۂ کاظمین پہنچ کر ختم ہوا۔

برصغیر میں لکھنؤ کو واحد وہ مرکزیت حاصل ہے جہاں دو ماہ آٹھ دن عزاداری کا سلسلہ رہتا ہے اور اختتام آٹھویں کے نام سے جو عشرہ مشہور ہے اس ضمن میں دو مقامات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔کربلا دیانت الدولہ میں انجمن حسینیۂ قدیم کے زیر اہتمام اور روضۂ کاظمین میں انجمن کاظمیۂ عابدیہ کے زیر اہتمام بڑے پیمانے پر آخری یوم غم پُرامن طریقے سے منایا گیا ہے۔